تعمیر حیات

لکھنؤ

پندرہ روزہ

خواتین کا نذرانۂ عقیدت

بارگاہِ رسالت میں

"ہم آپ پر درود وسلام بھیجتے ہیں یا رسول اللہؐ! ایسے طبقہ کا درود وسلام جس پر آپ کا بڑا احسان ہے، آپ نے ہم کو خدا کی مدد سے جاہلیت کی بیڑیوں اور بندشوں، جاہلی عادات و روایات، سوسائٹی کے ظلم اور مردوں کی زور دستی اور زیادتی سے نجات بخشی، لڑکیوں کو زندہ در گور کرنے کے رواج کو ختم کیا، ماؤں کی نافرمانی پر وعید سنائی۔

آپ نے فرمایا کہ جنت ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے،

آپ نے وراثت میں ہم کو شریک کیا، اور اس میں ماں، بہن، بیٹی اور بیوی کی حیثیت سے ہم کو حصہ دلایا، یوم عرفہ کے مشہور تاریخی خطبہ میں بھی آپ نے ہمیں فراموش نہیں کیا، اور کہا کہ:۔

"عورتوں کے بارے میں خدا سے ڈرو اس لئے کہ تم نے ان کو اللہ کے نام کے واسطہ سے حاصل کیا ہے۔"

اس کے علاوہ مختلف مواقع پر آپ نے مردوں کو عورتوں کے ساتھ حسن سلوک، ادائے حقوق اور بہتر معاشرت کی ترغیب دی، اللہ تعالیٰ آپ کو ہمارے طبقہ کی طرف سے وہ بہتر سے بہتر جزا دے جو انبیاء و مرسلین اور اللہ کے نیک اور صالح بندوں کو دی جا سکتی ہے۔"

(کتاب "کاروانِ مدینہ" ص)

از:

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

القرآن

★ ہمیں معلوم ہے کہ جو باتیں یہ لوگ تم پر بناتے ہیں ان سے تمہارے دل کو سخت کوفت ہوتی ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ "اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو، اس کی جناب میں سجدہ بجالاؤ اور اس آخری گھڑی تک اپنے رب کی بندگی کرتے رہو جس کا آنا یقینی ہے"۔
(الحجر ۹۷ تا ۹۹)

★ پس اے محمدؐ تم اور تمہارے وہ ساتھی جو (کفر و بغاوت سے ایمان و طاعت کی طرف) پلٹ آئے ہیں، ٹھیک ٹھیک راہ راست پر ثابت قدم رہو جیسا کہ تمہیں حکم دیا گیا ہے اور بندگی کی حد سے تجاوز نہ کرو۔ جو کچھ تم کر رہے ہو اس پر تمہارا رب نگاہ رکھتا ہے۔ ان ظالموں کی طرف ذرا نہ جھکنا ورنہ جہنم کی لپیٹ میں آجاؤ گے اور تمہیں کوئی ایسا ولی و سرپرست نہ ملے گا جو خدا سے تمہیں بچا سکے اور کہیں سے تمہیں مدد نہ پہنچے گی۔
(ہود: ۱۱۲ تا ۱۱۳)

★ ہم نے زمین اور آسمان کو اور ان کی سب موجودات کو حق کے سوا کسی اور بنیاد پر پیدا نہیں کیا ہے اور فیصلے کی گھڑی یقیناً آنے والی ہے۔
پس اے محمدؐ تم (ان بیہودگیوں پر) شریفانہ درگزر سے کام لو۔ یقیناً تمہارا رب سب کا خالق ہے اور سب کچھ جانتا ہے۔
(الحجر: ۸۵ تا ۸۶)

★ اور اے نبیؐ تم اس ہدایت کی پیروی کیے جاؤ جو تمہاری طرف بذریعہ وحی بھیجی جا رہی ہے، اور صبر کرو یہاں تک کہ اللہ فیصلہ کر دے اور وہی بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔
(یونس: ۱۰۹)

★ اے محمدؐ! ان لوگوں نے اس کوشش میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی کہ تمہیں فتنے میں ڈال کر اس وحی سے پھیر دیں جو ہم نے تمہاری طرف بھیجی ہے تاکہ تم ہمارے نام پر اپنی طرف سے کوئی بات گھڑو۔ اگر تم ایسا کرتے تو وہ ضرور تمہیں اپنا دوست بنا لیتے اور بعید نہ تھا کہ اگر ہم تمہیں مضبوط نہ رکھتے تو تم ان کی طرف کچھ نہ کچھ جھک جاتے، لیکن اگر تم ایسا کرتے تو ہم دنیا میں بھی دوہرے عذاب کا مزہ چکھاتے اور آخرت میں بھی دوہرے عذاب کا، پھر ہمارے مقابلے میں تم کوئی مددگار نہ پاتے۔
(بنی اسرائیل: ۷۳ تا ۷۵)

الحدیث

★ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ:-
"دعوتی کام کرنے والوں کو صابر اور بردبار ہونا چاہیے۔ لوگ اگر غصہ دلانے والی حرکات پر اتر آئیں تو ایسے موقع پر غصہ کا جواب غصے سے نہیں دینا چاہیے۔ غصہ آئے تو تھوک دینا چاہیے۔ اگر لوگ ایسا کریں تو اللہ تعالیٰ ان کی حفاظت فرمائے گا اور دشمن ان کے سامنے جھک جائے گا، وہ گہرا دوست اور پرجوش حامی بن جائے گا۔
(بخاری)

★ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلۂ قیس کے پاس دین اور دین کے احکام سکھانے کے لیے بھیجا، وہاں پہنچ کر مجھے تجربے سے معلوم ہوا کہ یہ بدکے ہوئے اونٹ ہیں۔ دنیا کے حریص، ان کا کوئی نصب العین نہیں ہے، ان کی ساری دلچسپی اپنی بکریوں اور اونٹوں سے ہے تو میں نبی صلی اللہ کے پاس واپس پہنچا، آپ نے پوچھا "عمارؓ! اپنے کام کی رپورٹ دو کیا کیا؟"
تو میں نے آپ کو سارا قصہ سنایا، میں نے آپ کو بتایا کہ یہ لوگ دین سے غافل ہیں۔
آپ نے فرمایا "اے عمارؓ! اللہ سے زیادہ تعجب خیز معاملہ ان لوگوں کا ہے جنہوں نے دین کا علم سیکھا مگر انہی کی طرح دین سے غافل اور بے پرواہ ہو گئے۔"

★ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "تم میں سے جس شخص نے اپنے معاشرے میں کوئی برائی دیکھی اور طاقت استعمال کر کے اسے دور کر دیا تو وہ اپنے فرض سے سبکدوش ہوا اور جس شخص نے طاقت نہ رکھنے کی وجہ سے اپنی زبان استعمال کی اور اس کے خلاف آواز اٹھائی وہ بھی سبکدوش ہوا اور جو شخص اپنی زبان سے استعمال کر سکا [illegible] برائی سے نفرت کرے اور [illegible] تو وہ بھی ذمہ داری سے بچ جائے گا اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔

(ترجمہ و ترتیب [illegible])

نبیِ اُمّی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ انسانی فلاح و بقا

انتخاب: مولانا افتخار فریدی مراد آباد

ایک سائل دنیا و آخرت کی فلاح و بقا و کامیابی کی راہ پانے کے چند سوال کرتا ہے۔

سائل: اے اللہ کے رسولؐ! میں چاہتا ہوں کہ دنیا کا سب سے بڑا عالم بن جاؤں۔
حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تو خدا سے ڈرتا رہ تو سب سے بڑا عالم بن جائے گا۔
سائل: میں چاہتا ہوں کہ تمام انسانوں سے زیادہ مالدار بن جاؤں۔
حضورؐ نے فرمایا: تو قناعت اختیار کر سب سے زیادہ مالدار ہو جائے گا۔
سائل: میں چاہتا ہوں کہ سب سے بہتر شخص ہو جاؤں۔
حضورؐ نے فرمایا: سب سے بہتر وہ ہے جو لوگوں کو نفع پہنچائے، سب کے لیے نفع بخش بن جا بہتر ہو جائے گا۔
سائل: سب سے زیادہ عادل بننا چاہتا ہوں۔
حضورؐ نے فرمایا: تمام انسانوں کے لئے وہی پسند کر جو اپنے لئے پسند کرتا ہے سب سے زیادہ منصف عادل بن جائے گا۔
سائل: سب لوگوں سے زیادہ خدا کے دربار میں مخصوص و مقرب بننا چاہتا ہوں۔
حضورؐ نے فرمایا: خدا کا ذکر خوب زیادہ کر خدا کے دربار میں مخصوص مقرب ہو جائے گا۔
سائل: میں محسنوں اور نیکوکاروں میں سے ہونا چاہتا ہوں۔
حضورؐ نے فرمایا: اللہ کی عبادت ایسی کر کہ تو دیکھ رہا ہے اگر یہ نہ ہو تو جیسے وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔
سائل: میں چاہتا ہوں میرا ایمان مکمل ہو جائے۔
حضورؐ نے فرمایا: اخلاق سنوار لے تیرا ایمان مکمل ہو جائے گا۔
سائل نے عرض کیا: میں اطاعت گزاروں میں سے ہونا چاہتا ہوں۔
حضورؐ نے فرمایا: اپنے فرائض ادا کرتے رہو تیرا مطیعین میں شمار ہو جائے گا۔
سائل: میں خدا سے اس حال میں ملنا چاہتا ہوں کہ تمام گناہوں سے پاک و صاف ہوں۔
حضورؐ نے فرمایا: تو جنابت سے غسل کیا کر اس کی برکت سے گناہوں سے پاک اٹھے گا۔
سائل: میں چاہتا ہوں حشر میں نور کے ساتھ اٹھایا جاؤں۔
حضورؐ نے فرمایا: تو کسی پر ظلم نہ کر قیامت کے دن نور میں اٹھے گا۔
سائل: میں چاہتا ہوں خدا مجھ پر رحم کرے۔
حضورؐ نے فرمایا: تو اپنی جان پر اور خلق خدا پر رحم کر خدا تجھ پر رحم کرے گا۔
سائل: میں چاہتا ہوں میرے گناہ کم ہوں۔
حضورؐ نے فرمایا: استغفار کثرت سے پڑھا کر تیرے گناہ کم ہو جائیں گے۔
سائل: میرے رزق میں زیادتی ہو۔
حضورؐ: ہمیشہ طہارت کے ساتھ رہ تیرے رزق میں برکت ہوگی۔
سائل: میں چاہتا ہوں خدا اور رسول کا دوست بن جاؤں۔
حضورؐ: جو خدا اور رسول کو پسند ہے وہ پسند کر جو خدا و رسول کو ناپسند ہے تو اسے ناپسند کر خدا اور رسول کا دوست بن جائے گا۔
سائل: میں خدا کے غضب سے بچنا چاہتا ہوں۔
حضورؐ: تو کسی پر بے جا غصہ نہ کر تو خدا کے غضب و ناراضی سے بچ جائے گا۔
سائل: میں خدا کے دربار میں مستجاب الدعوات بننا چاہتا ہوں۔
حضورؐ: تو حرام چیزوں اور لقموں سے بچ تو مستجاب الدعوات بن جائے گا۔

پندرہ روزہ

تعمیر حیات

شعبۂ تعمیر و ترقی دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

۲۵ مارچ ۱۹۷۶ء مطابق ۲۰ ربیع الاول ۱۳۹۶ھ

فی شمارہ ۵۰ پیسے — سالانہ بارہ روپے

جلد نمبر ۱۳ — شمارہ نمبر ۱۰

اسحاق جلیس ندوی

یوم رحمتِ عالم ﷺ

ہفت روزہ صدق جدید لکھنؤ کی ۲۰ فروری ۱۹۷۶ء کی اشاعت میں ایک مراسلہ "تجویز" کے عنوان سے یہ مراسلہ شائع ہوا ہے:

"ہم لوگ اسلام کو عملی شکل میں نہ پیش کرنے کا ذکر تو اکثر کرتے ہیں ... کہ ہم غیروں کے سامنے عوامی پیمانے پر ہر زبان میں اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کا تعارف ہی کراتے۔ بیسیوں ادارے قائم ہونے چاہئیں لیکن یہ ضرورت اپنی جگہ پر قائم ہے۔ اس سلسلے میں بندہ ناچیز کی یہ تجویز ہے کہ کم از کم میلاد النبی ﷺ کے موقع پر ملک کی تمام زبانوں کے کم از کم ایک روزنامے میں اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے عنوان سے سپلیمنٹ (ضمیمہ) شائع کرانے کا انتظام کیا جائے۔

اثر کرے دل میں اتر جائے مری بات

(ابن غوری، بھوپال)

اس تجویز کے مفید اور اہم ہونے سے شاید ہی کسی کو اختلاف ہو لیکن ہو سکتا ہے کہ خیال ہو کہ جلسے جلوس اور نمود و نمائش پر ہزاروں روپے صرف کرنے کی عادی ہو رہی ہے اس قسم کی تعمیری اور مفید تجاویز پر غور و عمل کی فرصت کہاں ہے۔

اس ملک میں مسلمان کم و بیش ایک ہزار سال سے رہتے ہیں۔ یہاں اہل وطن سے ہمارا سابقہ رہا، ان سے ہمارا قدم قدم پر سابقہ و واسطہ پڑتا ہے لیکن اس کے باوجود غیر مسلموں کی عام اکثریت اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں طرح طرح کی غلط فہمیوں کا شکار ہے۔ مسلمانوں سے بعد و نفرت میں وہ اس درجہ مبتلا ہے کہ ان کے نزدیک مسلمان ایک مختلف ثقافت، تہذیب و تمدن والا انسان نہیں ہو سکتا۔ اس بعد و نفرت کی آگ میں انگریزوں کی ڈپلومیسی اور ماضی کی سیاسی بدعنوانیوں نے تیل کا کام کیا۔

ہمارے اہل وطن کی ایک بڑی تعداد مسلمانوں سے نفرت نہیں کرتی ہے تاہم وہ اسلام کی دعوت اور پیغمبر اسلام کی تعلیمات سے قطعاً ناآشنا ہے۔ وہ اس نبی سے جس کے بارے میں قرآن نے "وما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین" فرمایا ... جس نے ہلاکت کی طرف بڑھنے والے انسانوں کو کھینچ کھینچ کر ہلاکت سے بچایا اور دنیا کے تمام انسانوں کو خدا کا کنبہ قرار دیا۔ اس ملت نے رحمت عالم کے یوم ولادت کو ان کی تعلیمات و ارشادات کی اشاعت و تبلیغ کا ذریعہ بنانے کے بجائے اپنے ذوق و نظر کی تسکین کا سامان اور اپنی تفریح کا مشغلہ بنا لیا ہے۔ بیسویں صدی کی دنیا کے انسانوں کے کرب کا علاج اور زخم کا مرہم شفا جس ذات گرامی کی ... ہی سے میسر ہو سکتا ہے لیکن ... اسے ... ہو جانے میں ہم نے غفلت برتی ...

ایک طرف تو عالم انسانیت کو فیض نبوت سے محروم کئے ہوئے ہیں تو دوسری طرف خود اپنے ملی وجود کو خطرے میں ڈال رہے ہیں۔

مسلمانوں کی اس غفلت نے اندلس میں کیا گل کھلائے۔ آٹھ سو سالہ شان و شوکت، اقتدار و حکمرانی کے باوجود ... اندلس میں مسلمانوں کے زوال کے بعد ... اس ملک کی تعمیر و ترقی اور دنیا کی تاریخ میں ... اندلس میں مسلمانوں کی تباہی کے اسباب، حکومت کے خاتمے اور ان کے وجود کے مٹ جانے میں حقیقت حال کا کام کرتے ہیں۔ تاریخ کا تجزیہ کیجئے تو روز روشن کی طرح یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ مسلمانوں نے اپنے دور عروج و اقبال میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت، پیغمبر اسلام کی سیرت و تعلیمات کو اپنے برادران وطن تک پہنچانے اور ان کے دل و دماغ کو دین کی دعوت سے متاثر کرنے میں بڑی غفلت برتی۔ یہی وجہ تھی جیسا کہ اپنے ماضی کی تاریخ اور مسلمانوں کی ان پر حکمرانی کا داغ نسل در نسل منتقل کرتی رہی اور ہر آنے والی نسل اسلام کی اصل روایات اور پیغمبر اسلام کی پاکیزہ سیرت سے بے خبر مسلمانوں سے انتقام لینے اور انہیں نیست و نابود کرنے کے جذبے سے سرشار ہوتی گئی۔ تاریخ شاہد ہے کہ اندلس کے مسلمانوں پر پھر وہ گھڑی آئی کہ جس کا ہم وہاں بھی کہیں انہیں اپنے دور عروج میں تصور نہ ہوا ہوگا۔

برصغیر کی ہزار سالہ تاریخ میں اور اندلس کے ہشت صد سالہ واقعات میں حیرت انگیز مماثلت ہے۔ امت مسلمہ نے اپنی اس ذمہ داری کو اس ملک میں محسوس نہیں کیا جو خیر امت کی حیثیت سے اس پر خدا و رسول ﷺ کی طرف سے عائد کی گئی تھی۔ اس نے ۸ سو برس یعنی کم و بیش آٹھ سو سال دوبارہ ... اپنے دور اقبال میں ... مسلمان اپنی سلطنت و اقتدار کو دائمی اور ابدی سمجھتے رہے۔ ان میں بعض ایسے بزرجمہر بھی گذرے جنہوں نے اس ملک کے انسانوں کے باہمی اتحاد کے لئے ان طریقوں کو اپنایا جو مزید ہلاکت و تباہی اور انسانوں کو نجات کے بجائے عذاب کی طرف لے جانے والا تھا۔ اکبر کا دین الٰہی اس کا ایک نمونہ ہے۔

چند بوریا نشین فقراء اور صوفیاء کے علاوہ کسی کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ وہ اس وسیع و عریض خطۂ زمین پر بسنے والے انسانوں کو اس پاکیزہ زندگی سے آشنا کرتا جو نمونۂ عمل بھی تھی اور ذریعۂ فلاح و نجات بھی۔ جو اس دنیا میں بھی سکون و عافیت کی ضمانت تھی اور آخرت میں بھی ابدی نجات کا واحد ذریعہ ——— تاریخ کے اوراق الٹتے گئے اور عروج و اقبال کا آفتاب جب مائل بہ زوال ہوا تو ہم ایک ایسی اکثریت کے درمیان گھرے تھے جو ہمارے رہنما سے اور ہمارے اس نبی سے ناآشنا تھی جو رحمت عالم بھی تھا اور محسن انسانیت بھی ——— ان حالات میں اس کی کوتاہی کی تلافی اس ملک میں ہمارا دن رات کا مشغلہ اور وظیفۂ زندگی بن جانا چاہئے تھا مگر کارواں اب بھی احساس زیاں سے محروم ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ کارواں کسی مخصوص ایمان و عقیدہ، نظام حیات اور اعلیٰ مقصد زندگی کے حامل با بصیرت افراد پر مشتمل نہیں بلکہ حقائق سے بے خبر، اپنے ماضی، حال اور مستقبل سے بے نیاز، اپنے مقصد وجود سے ناآشنا اور فکر و عمل ... زدہ بے چارے انسانوں کا ایک ریوڑ ہے جسے ہر طالع آزما جہاں چاہتا ہے ہانک لیتا ہے اور تباہی کے جس گڑھے میں چاہتا ہے ڈال دیتا ہے۔ یہ ہر مداری کے پیچھے چلنے پر آمادہ اور ہر نادان دوست کو اپنا رہنما بنانے پر تلا ہوا ہے۔ ملت اسلامیہ کی تباہی اور اس کے نتیجے میں عالم انسانیت کی پامالی کا یہ مسلسل سلسلہ برابر جاری ہے۔

کیا رحمت عالم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا یوم ولادت اس تزک و احتشام سے منانے والے کبھی ٹھنڈے دل سے اس پر غور کریں گے کہ یہ دن یوم احتساب بھی ہے۔ احتساب اپنا، اپنی جماعت کا اس نقطۂ نظر سے کہ فرد نے یا جماعت نے دعوت دین کی اشاعت اور محسن انسانیت ﷺ کی مثالی سیرت کے تعارف کا حق کہاں تک ادا کیا۔ یہ اس اسوہ کو انفرادی اور اجتماعی شکل میں کہاں تک اپنایا گیا جس کا اثر دیکھ کر مخالفین دوست بن جاتے تھے، دشمن جاں نثار ہو جاتے تھے، غلط فہمیوں کے شکار ندامت کے آنسو بہاتے تھے، دور ہو جانے والے قافلے اس کی کشش سے کھنچ آتے تھے۔

مسلمانوں کو سیرت پاک پر جلسوں اور جلوسوں کے بظاہر عید میلاد النبی ﷺ کی خوشی میں یہ میلا سا لگنے دیجئے ... نمائش، سجاوٹیں اور تقاریب بہت مبارک، لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ دنیا کے عام انسانوں تک ایسے انداز سے جس سے وہ متاثر ہوں اور ان کا دل دین حق کی حقانیت کی گواہی دے پاکیزہ ... ان کے جذبۂ انتقام و نفرت ... ماند پڑ سکے۔ ان مقاصد میں عید میلاد النبی ﷺ کے یہ پروگرام کہاں تک مفید بن سکتے ہیں۔؟

یہ وہ سوال ہے جس پر ہمیں سنجیدگی سے غور کرنا ہوگا۔

پرشکوہ عمارات کے ذریعے ہم طوفان آمد ... تو اٹھا سکتے ہیں مگر تعمیر ملت اور فلاح انسانیت کی مستحکم عمارت سیرت ہی کی بنیادوں پر قائم رہ سکتی ہے۔

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر

ترا زجاج ہو نہ سکے گا حریف سنگ

مولانا عبدالباری ندوی کی کتاب

"مذہب اور سائنس"

از: ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی ـــــ سابق وائس چانسلر پشاور یونیورسٹی

اردو زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کے علاوہ جامعہ عثمانیہ کی ایک اور امتیازی خصوصیت یہ بھی کہ اس نے جدید و قدیم سائنس اور روایتی علوم یعنی معقولات اور منقولات کی تفریق ختم کر کے ایک ایسی درسگاہ بنانے کی کوشش کی جس میں علم کو بحیثیت مجموعی ایک وحدت کے طور پر پڑھایا اور سیکھا جائے۔ اسی اصول کے تحت جامعہ کے تمام شعبوں نے ایسے منتخب علماء جمع کئے گئے جو علم کی کسی ایک شاخ کے ماہر ہونے کے علاوہ وسیع نظر رکھتے اور مختلف شاخوں کے باہمی ربط اور ایک دوسرے پر ان کے اثرات سے بخوبی واقف تھے یہی وجہ ہے کہ سائنس، آرٹس، انجینئرنگ اور طب وغیرہ مضامین کے شعبوں (فیکلٹیوں) کے ساتھ ساتھ ابتداء ہی سے ایک فیکلٹی دینیات کی بھی بنائی گئی اور اس فیکلٹی کے طلباء کو سائنس اور آرٹس کے مضامین سے واقف کرایا گیا۔ اسی طرح ان جدید علوم کے طلباء کے لئے دینیات کی تعلیم بھی لازمی۔ اسے اس درجہ تک لازمی قرار دیا گیا جس میں اسلام کے عقائد اور ارکان ہی کی تعلیم نہیں بلکہ مذہب کے بنیادی اصول اور اس کا فلسفہ بھی بتایا جاتا تھا اور سائنس کے نام پر جو غلط فہمیاں پیدا کر کے گمراہی اور الحاد پھیلایا جا رہا تھا اس کی تردید کی جاتی تھی۔

خوش قسمتی سے دینی و دانش کے اس مضمون کو پڑھانے کے لئے مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم و مغفور جیسا باکمال استاد میسر آگیا تھا جن کی تعلیم اور انداز بیان اس قدر دلنشین اور دلکش تھا کہ تمام طلباء ان کے درس میں جوق در جوق رجوع کرتے تھے اور ان کے لکچروں کو غیر مسلم انہاک کے ساتھ سنا کرتے تھے، راقم الحروف کو بھی ان کی شاگردی کی سعادت نصیب ہوئی تھی اور انہی کے توسط سے حضرت مولانا عبدالباری ندوی مدظلہ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا، جامعہ میں کم و بیش بیس سال تک مولانا کی رفاقت حاصل رہی، حضرت قدیم فلسفے سے متعلق تھے اور میں شعبہ ریاضی سے، حضرت مولانا قدیم و جدید فلسفہ اور علم الکلام سے تو بخوبی واقف ہی تھے لیکن اس کے ساتھ وہ جدید سائنس کے اہم اصول اور نتائج اور فلسفہ اور کلام پر ان کے اثرات سے بھی واقف ہونا چاہتے تھے اور میں خود اضافیت اور کوانٹم (QUANTUM) کے ریاضیاتی نظریوں پر درس دیا کرتا تھا اور ظاہر ہے کہ فلسفہ اور کلام پر ان دونوں نظریوں کا بڑا گہرا اثر پڑ رہا تھا، اسی تعلق سے مجھے حضرت مولانا کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا اور ان مسائل پر اکثر گفتگو رہی۔ گردش ایام کے سبب گزشتہ بیس سال کے دوران حضرت مولانا سے نیاز تو حاصل نہیں ہو سکا البتہ وقتاً فوقتاً خط و کتابت کے ذریعہ معلوم ہوتا رہا کہ موصوف انہی مسائل پر غور و فکر کرنے کے بعد فلسفہ، کلام اور سائنس کے باہمی تعلق اور اثرات پر ایک کتاب کی تصنیف میں مصروف ہیں۔ چند ماہ قبل حضرت مولانا نے مجھے خط ارشاد فرمایا کہ اس کتاب پر مقدمہ تحریر کروں۔ حضرت مولانا کی نظر عنایت تو شروع ہی سے مبذول رہی ہے لیکن میرے لئے یہ مشکل آپڑی ہے کہ میں یہ جسارت کس طرح کروں۔ بہرحال جب حضرت مولانا نے از راہ ذرہ نوازی یہ سعادت بخشی ہے تو اس کو قبول نہ کرنا کفران نعمت کے مترادف ہوتا۔ امتثال امر کے طور پر یہ چند سطریں لکھ رہا ہوں۔

یوں تو میں ایک عرصے سے واقف تھا کہ حضرت مولانا کس گہری نظر سے ان حقائق کا مطالعہ کر رہے ہیں، جو فلسفہ، کلام اور سائنس کے امتزاج سے منکشف ہو رہے ہیں لیکن اس کتاب کے مسودہ کو پڑھنے کے بعد ہی پتہ چلا کہ حضرت مولانا کا مطالعہ کس قدر وسیع رہا ہے، اور انہوں نے قدیم یونانی فلسفے سے لے کر آج تک بڑے بڑے علماء اور حکماء کی اصل تصنیفوں اور مقالات سے اپنے موضوع کے متعلق کس طرح قیمتی مواد حاصل کیا ہے اور پھر اس مواد کی تحلیل اور تشریح کے بعد ایک مدلل پیرایہ میں کیسے کیسے نتیجے اخذ کئے ہیں۔

راقم الحروف نے بھی گذشتہ ۲۰-۳۰ سال کے دوران زمان و مکان، جدید و قدیم سائنس اور مذہب سے متعلق متعدد تقریریں کی ہیں اور متفرق مضامین لکھے ہیں جو مختلف رسالوں میں شائع ہوئے، اس لئے حضرت مولانا کی کتاب کو پڑھ کر ایک گونہ ہمت افزائی اور مسرت ہوئی کہ دونوں کے خیالات میں کس قدر توافق اور ہم آہنگی ہے۔ تعجب اس لئے نہیں ہوا کہ دونوں کا علم اور فکر کا منبع

ایک ہی مبدا فیض سے حاصل ہوا ہے۔

حضرت مولانا نے بحث کا آغاز اس نکتہ سے کیا ہے کہ انسان کو بقول غالب ؎

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں

یا بقول اقبال ؎

طلسم بود و عدم جس کا نام ہے آدم

اقبال نے "اسرار خودی" میں تفصیل سے بتایا ہے کہ انسانیت اور خودی کی تکمیل تخلیق مقاصد ہی سے ہوتی ہے اور حضرت مولانا عبدالباری بھی بڑی شرح و بسط کے ساتھ یہ بتاتے ہیں کہ یہی نامعلوم طلبی "انسان کا طرہ امتیاز ہے" اور اس سلسلہ میں جستجو کا دروازہ اس کے نظریۂ معرفت پر ہوتا ہے۔ اسی ایمان بالغیب کا تقاضا ہے کہ انسان اپنے علم ہی کسی ایسی حد پر ٹھیرنا گوارا کرتا ہے جس کے آگے کوئی مجہول باقی رہ جائے اور نہ قوت و قدرت کے کسی ایسے درجہ پر قانع رہتا ہے جس کے بعد کوئی چیز اس کی طاقت سے باہر رہ جائے اسی لئے قرآن میں انسان کو "خلیفۃ اللہ فی الارض" کہا گیا ہے، انسان کو جس غیب کا علم ہے وہ اعتباری اور اضافی ہے اور اس کائنات اور اس کی درمیانی حالت تک محدود ہے، غیب مطلق اور تخلیق کائنات کی ابتداء اور انتہا کے متعلق اس کو فلسفہ اور سائنس کی مدد سے کچھ بھی نہیں معلوم ہو سکتا کیونکہ عقل محض اور حواس انسانی کی رسائی اس حد تک نہیں ہے۔

اس کے بعد مولانا نے متعدد صفحات پر پھیلی ہوئی ایک طویل تشریح بیان فرمائی ہے جس میں بڑے بڑے سائنسدانوں کے مقولوں کی مدد سے مادہ اور زمان و مکان کے متعلق جدید تصورات پیش کئے گئے ہیں اور یہ بتایا گیا ہے کہ اب مادہ ایسی ٹھوس شے ہے اور نہ زمان و مکان ایسے مطلق تصور ہیں جیسے ۱۹ویں صدی کے آخر تک سمجھا جاتا تھا، اس ضمن میں حضرت مولانا نے راقم الحروف سے ایک گفتگو کا بھی حوالہ دیا ہے جس میں کہا گیا کہ نظریہ اضافیت اور "مکان، زمان" کے جدید تصور کو کماحقہ سمجھنے کے لئے ریاضی سے واقفیت کی ضرورت ہے۔ اس معاملہ میں سب سے اہم اور کلیدی لفظ "مکان" ہے اور یہ حقیقت آج بھی اسی طرح صحیح ہے

جس طرح حضرت مولانا سے گفتگو کے وقت صحیح تھی، چنانچہ اس وقت کا کچھ اندازہ اس ایک واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ اکثر اشخاص جو ریاضیات سے پوری طرح واقف نہیں ہوتے اس غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں کہ نظریہ اضافیت نے زمان کو مکان کا ایک جزو بنا دیا ہے حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے بلکہ مکان اور زمان دونوں بھی اجزا ہیں ایک تیسرے کل کے جس کو "مکان-زمان-مسلسلہ" (SPACE-TIME-CONTINUUM) کہتے ہیں اور جو ایک چار ابعادی سمتیہ (FOUR-DIMENSIONAL VECTOR) ہے۔ اس کو عام فہم زبان میں ٹھیک ٹھیک بیان کرنا امر محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ کچھ تشریح اس طرح کی جا سکتی ہے کہ اگر ایک ہی واقعہ کو دو مختلف مشاہد جو ایک دوسرے کی اضافت سے متحرک ہوں، مشاہدہ کریں تو اس مقابلہ کے لئے لورینٹز (LORENTZ) کے تحویلی تبادلہ (TRANSFORMATION) استعمال کرنا پڑے گا اس کے فارمولوں میں نہ صرف مکان کے فارمولے میں زمان بھی داخل ہوگا بلکہ زمان کے فارمولے میں مکان بھی شامل ہوگا، یعنی مکان اور زمان دونوں ایک دوسرے پر منحصر ہوں گے۔ نیوٹن کے نظریہ میں یہ بات نہیں تھی بلکہ زمان بالکل مطلق تھا اور دو مختلف مشاہدین کے مقام یا حرکت کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا، اور زمان کے فارمولے میں مکان کبھی شامل نہیں ہوتا تھا، اگرچہ مکان کے فارمولے میں زمان شامل ہوتا تھا۔ ایک ریاضی داں کے لئے گویا "اتنی سی بات" تھی جسے افسانہ کر دیا۔ لیکن غیر ریاضی داں شاید اس کو "اتنی سی بات" ہی ماننے کے لئے تیار نہ ہوں، بلکہ بہت ممکن ہے اس تشریح کو مزید وضاحت اور تشریح طلب سمجھیں۔

بہرحال پیش نظر کتاب میں جو نتیجے اخذ کئے گئے ہیں جو کہ ان کا سارا دار و مدار مادہ، توانائی اور زمان و مکان کے جدید تصورات پر ہے اور اگرچہ ان تصورات کو مولانا نے نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان فرمایا ہے تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان تصورات کو یہاں مختصر طور پر ایک جگہ پیش کر دیا جائے تاکہ قارئین کو اصل کتاب کے مطالعہ میں سہولت ہو۔

جب نیوٹن نے سترہویں صدی میں قانون تجاذب کا انکشاف کیا اور علم حرکت کی مدد سے کی قوانین قرار دیئے ... کا اطلاق نہ صرف روئے زمین پر پیش آنے والے واقعات پر کیا گیا بلکہ نظام شمسی کے سیاروں اور دوسرے اجرام فلکی پر بھی اس کو وسعت دی گئی اور اس کے مشہور ریاضی داں لاپلاس نے یہ دعویٰ کیا کہ اگر کسی وقت کائنات کی ہر شے کی کیفیت معلوم ہو سکتی ہے اور اس میں کسی گوشے ...

کہا جاتا ہے اس کا مطلب یہ لیا گیا، اب اس کے بعد طبیعی سائنس میں کسی کے لئے کچھ کہنا باقی نہیں۔ انیسویں صدی میں اس میکانکس کی جڑیں اس قدر مضبوط ہو گئیں کہ نہ صرف طبیعی سائنس بلکہ حیاتیاتی علوم میں بھی اس کا اطلاق کیا جانے لگا اور انسانی اعمال بلکہ دماغ کے خیالات کی تشریح بھی میکانی اصول پر ہونے لگی اور یہ کہا جانے لگا کہ جس سائنس کی بنیاد اس میکانی اصول پر نہ ہو وہ سائنس کہلانے کی مستحق ہی نہیں ہو سکتی۔

علوم فلکیات، طبیعیات، کیمیا اور حیاتیات میں ۱۹ویں صدی کی غیر معمولی ترقی کی وجہ سے مادیت اور دہریت کو زبردست تقویت پہنچی اور ظاہر بین لوگوں نے یہ سمجھنا شروع کیا کہ سائنس نے مذہب کی جڑیں کھوکھلی کر دی ہیں کیونکہ اس میکانکس کی بموجب کائنات میں علت و معلول کا ایک سلسلہ کارفرما ہے جس کی بنا پر اس کی تخلیق بھی ہوئی اور تشکیل بھی ہو رہی ہے، اور نہ تو کسی خالق کی ضرورت ہے اور نہ قیوم کی۔

علمی دنیا کا یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ جب نیوٹن کے نظریوں پر مبنی طبیعیات انیسویں صدی میں اپنے عروج پر پہنچ رہی تھی، عین اسی زمانہ میں پے در پے چند ایسے تجربے اور مشاہدے ہوئے کہ خود اس علم کی بنیادیں ہل گئیں اور علم طبیعیات میں ایک ہمہ گیر انقلاب رونما ہوا۔ مادہ اور توانائی، قوت اور حرکت، جوہر اور عنصر، زمان و مکان اور علت و معلول جیسے ہمارے تصورات سرے سے بدل گئے اور خود قوانین قدرت کا بھی ایک نیا مفہوم لیا جانے لگا۔ ان تغیرات نے نیوٹن اور میکسویل کی طبیعیات کی بجائے اس جدید طبیعیات کی تشکیل کی جس کی بنیاد کوانٹم اور اضافیت کے نظریوں پر رکھی گئی ہے۔

انیسویں صدی کی طبیعیات میں مادہ اور توانائی ایک دوسرے کے متضاد تصور تھے۔ مادہ کے متعلق سمجھا جاتا تھا کہ وہ ایک جسم ہے جو ایک محدود جگہ گھیرتا ہے، حرکت کرتا ہے اور جس کا ایک مستقل وزن ہوتا ہے جس کو کم بیش یا معدوم نہیں کیا جا سکتا۔ جب کوئی مادی شے حرکت کرتی ہے تو وہ ایک ہی لمحہ میں ایک ذرہ کی طرح حرکت کرتی ہے، اگر دریا یا روشنی کی موجوں کی طرح پوری فضا میں نہیں پھیل جاتی۔ اس کے برخلاف روشنی اور توانائی کے متعلق یہ خیال تھا کہ وہ کوئی جسم نہیں ہے اور کسی محدود جگہ کو گھیرتی نہیں بلکہ پھیلتی ہے۔ اس کا کوئی وزن نہیں ہوتا اور وہ موجوں کی شکل میں حرکت کرتی ہے۔ لیکن جدید طبیعیات میں مادہ اور توانائی کا

اختلاف ختم ہو گیا ہے اور تجربوں سے ثابت ہو چکا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کی مختلف شکلیں ہیں۔ کبھی مادہ توانائی میں تبدیل ہو جاتا ہے اور کبھی توانائی مادہ میں۔ کسی مادی شے کی کمیت مستقل نہیں بلکہ اس کی حرکت پر منحصر ہوتی ہے اور اس کی رفتار کے ساتھ گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ ایک مادی ذرہ کبھی ذرہ کی طرح ایک خاص حرکت کرتا ہے اور کبھی موجوں کی طرح پھیلتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ مادہ کے توانائی میں منتقل ہونے کا یہی اصل اصول ہے جس کی بنا پر ایٹم بم بنایا گیا ہے۔

بیسویں صدی کے آغاز یعنی ۱۹۰۰ء میں پلانک (PLANCK) نے کوانٹم (QUANTUM) کا انکشاف کیا اور بتایا کہ توانائی اور مادی نظام کی حالتوں میں تبدیلی مسلسل نہیں بلکہ ایک خاص قلیل ترین مقدار یعنی کوانٹم کے اضعاف (MULTIPLES) کے مناسب ہوتی ہے۔ اس انکشاف کے بعد قدیم ترین زمانہ سے طبیعی کائنات میں تغیر و تبدل کے مسلسل اور وحدانی ہونے کا جو تصور چلا آرہا تھا وہ ختم ہو گیا اور اس کی وجہ سے نیوٹن کی میکانکس میں ایک ہمہ گیر انقلاب رونما ہوا۔

ایٹم (جوہر) کے متعلق ۱۹۰۰ء تک یہی سمجھا جاتا تھا کہ وہ مادہ کا سب سے چھوٹا ذرہ ہے جس کی مزید تقسیم نہیں کی جا سکتی۔ لیکن اس کے بعد پتہ چلا کہ ہر ایٹم کے اندر بہت سے اور چھوٹے ذرے ہوتے ہیں، جن کو الکٹرون، پروٹون اور نیوٹرون کہتے ہیں۔ کسی ایٹم کا مادہ مسلسل پھیلا ہوا نہیں ہوتا بلکہ یہ ذرے اس کے اندر نظام شمسی کی طرح ترتیب دئے ہوئے ہوتے اور چند معینہ مداروں پر حرکت کرتے رہتے ہیں۔ ایٹم کے مختلف ذروں کے درمیان اسی طرح وسیع خلا ہوتا ہے، جیسے سورج اور اس کے سیاروں کے درمیان۔ ایٹم کے مرکزی حصہ میں جس کو "نیوکلیس" کہا جاتا ہے، اس کا تقریباً تمام مادہ مرتکز ہوتا ہے اور اسی کی شکست و ریخت سے ایٹم کی ماہیت بھی بدل جاتی ہے اور ایٹمی توانائی بھی حاصل ہوتی ہے۔ اب تو ایسے ذروں کی ایک کثیر تعداد دریافت ہوئی ہے جو نہ تو مادی ذرے ہیں یا ایک مادی ذرہ اور شعاع (RADIATION) کے باہمی تعامل کے ذریعہ ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

کیمیائی عناصر سے متعلق سابقہ تصور یہ تھا کہ وہ ایک خاص قسم کے مادہ سے متعلق ہوتے ہیں اور ان کی ہیئت و ماہیت ہمیشہ ایک ہی ہوتی ہے جیسے ہائیڈروجن یا آکسیجن یا سوڈیم وغیرہ۔ چند سال قبل تک خیال تھا کہ ایسے کیمیائی عناصر کی تعداد ۹۲ ہے اور ایک عنصر کو دوسرے عنصر میں تبدیل کرنا وہی امر محال ہے جس کی تلاش میں قرون وسطیٰ میں کیمیا گروں نے اپنی عمریں ضائع کیں لیکن آج کل کیمیا گری تجربہ خانہ میں

ہر وقت کی جا رہی ہے اور بعض عناصر میں قدرتی طور پر بھی ہوتی رہتی ہے۔ ایک عنصر کے مختلف ہمجا ہو سکتے ہیں، جن کو (ISOTOPES) کہا جاتا ہے، اور تجربہ خانہ میں مصنوعی طور پر نہ صرف [illegible] بلکہ نئے عناصر بھی بنائے جا رہے ہیں اور گذشتہ تیس سال میں تقریباً دس نئے عنصر پلوٹونیم وغیرہ دریافت کئے جا چکے ہیں۔ اسی سلسلہ میں زمان و مکان کے جدید تصور کو بیان کرنا ضروری ہے۔ آئن اسٹائن نے ۱۹۰۵ء میں نظریاتی اور تجرباتی دونوں قسم کی وجوہات کی بنا پر بتایا کہ مطلق مکان اور مطلق زمان کا تصور جس کو نیوٹن اور اس سے قبل فلاسفہ اور حکماء نے پیش کیا تھا، اب قابل قبول نہیں رہا۔ آئن اسٹائن نے مثالیں دے کر واضح کیا کہ دو واقعات کا ہم وقت ہونا ایک اضافی چیز ہے، ایک مشاہد کے لئے جو واقعات ہم وقت ہوں ضروری نہیں کہ دوسرے مشاہد کے لئے بھی وہ ہم وقت ہوں بلکہ یکے بعد دیگرے ہو سکتے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ وقت کے بہاؤ کی شرح کا بھی ان دونوں کے لئے یکساں ہونا ضروری نہیں۔ غرض آئن اسٹائن نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ زمان یعنی وقت ...... کوئی مطلق شے نہیں بلکہ اضافی ہے، ہر مشاہد کا ایک خاص ذاتی وقت ہوتا ہے اور اگر دو مشاہد جو باہم ایک دوسرے کے اضافی حرکت کر رہے ہوں تو ان کے وقت بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوں گے۔

اسی طرح مکان یعنی فضا بھی مطلق نہیں، بلکہ اضافی ہے کیونکہ دو متحرک اشیاء کے درمیانی فاصلے کے کوئی معنی نہیں جب تک یہ نہ بتایا جائے کہ کس خاص وقت کے لئے یہ فاصلہ ناپا جا رہا ہے اور کون سا مشاہد اس فاصلے کو ناپ رہا ہے۔ اب چونکہ وقت خود اضافی ہے اس لئے فاصلہ جو وقت پر منحصر ہے، وہ بھی اضافی ہو گا۔

احوال و مقامات پہ موقوف ہے سب کچھ
ہر لحظہ ہے سالک کا زمان اور مکان اور

(اقبال)

غرض نظریہ اضافیت کی رو سے زمان اور مکان مطلق اور ایک دوسرے سے آزاد نہیں بلکہ اضافی اور ایک دوسرے پر منحصر ہیں۔ کائنات میں دو مختلف چیزیں مکان اور زمان نہیں بلکہ ایک ہی شے "مکان۔زمان" پائی جاتی ہے جس میں مکان اور زمان گھل مل جاتے ہیں اور ہم حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ۱۹ویں صدی تک دنیا کا جو تصور ہمارے ذہن میں تھا وہ بدل گیا۔ اب چار ابعاد (FOUR DIMENSIONS) ان کے لئے ہیں کیونکہ کائنات محض خاص اور [illegible] کا مجموعہ نہیں بلکہ واقعات پر مشتمل ہوتی ہے اور کسی واقعہ کو متعین کرنے کے لئے صرف اس کے جائے وقوع کا بیان کرنا کافی نہیں بلکہ یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ وہ واقعہ کس وقت ظہور پذیر ہوا۔ نظریہ اضافیت کی بنا پر آئن اسٹائن نے

ایک نتیجہ یہ بھی اخذ کیا کہ ایک مشاہد کے لئے کسی بھی شے کی کمیت میں، جو اس مشاہد کے لحاظ سے حرکت میں ہو، اضافہ ہونا لازمی ہے۔ تجربے سے بھی اس نتیجہ کی تصدیق ہوئی اور اس طرح کمیت اور وزن بھی اضافی اشیاء قرار پائیں۔

نیوٹن نے مکان، زمان اور کمیت کے ساتھ قوت کو بھی مطلق تصور کیا تھا، لیکن ہم دیکھ چکے ہیں کہ مکان، زمان اور کمیت اضافی مفہوم ہیں، مختلف مشاہد اپنے اپنے نظام میں ان کی مختلف قیمتیں حاصل کرتے ہیں، قوت بھی چونکہ فاصلہ اور کمیت پر منحصر ہوتی ہے اس لئے اپنے نظریۂ اضافیت کو ترجیح دے کر آئن اسٹائن نے بتایا کہ زمان، مکان اور کمیت کی طرح قوت بھی ایک اضافی تصور ہے بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر آئن اسٹائن نے کہا کہ قوت کا علیحدہ تصور ہی بیکار ہے اور حقیقت تک ہماری رسائی میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔ قوت کوئی خارجی شے نہیں جو مکان، زمان سے علیحدہ ہو بلکہ اسی مکان۔زمان کی ایک حالت ہے جو ہم کو قوت کے طور پر محسوس ہوتی ہے جتنے تجربے اور مشاہدے ہیں ان کی توجیہ مکان۔زمان کی حالتوں کے لحاظ سے کی جا سکتی ہے، علیحدہ قوت کا مفہوم داخل کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا بلکہ مزید پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔

اس کو سمجھنے کے لئے چند مثالیں مفید ہوں گی۔ ایک دریا کا پانی پہاڑ سے نکل کر وادی میں بہتے ہوئے سمندر میں جا گرتا ہے تو کیا ہم کہتے ہیں کہ دریا کو سمندر سے عشق ہے اور اسی عشق کی قوت پانی کو مجبور کرتی ہے کہ سمندر میں جا گرے۔ ہم یہی کہیں گے کہ یہاں عشق کی قوت کا مفہوم داخل کرنا غیر ضروری ہے اور دریا اس لئے نہیں بہتا کہ سمندر اس کو کھینچتا ہے بلکہ اس لئے بہتا ہے کہ اس مقام پر زمین کی ہیئت ہی اسی طرح کی ہے اور یہ اس کے لئے آسان ترین راستہ ہے۔

اسی طرح کسی جسم کی حرکت کے متعلق یہ کہنا کہ حرکت ایک قوت کی وجہ سے ہوتی ہے غیر ضروری پیچیدگی پیدا کرتا ہے۔ بلکہ یوں سمجھنا چاہئے کہ جسم جہاں واقع ہے اس کے گرد و پیش مکان۔زمان کی حالت ہی کچھ ایسی ہے کہ جسم کا آسان ترین راستہ وہی ہے جو وہ اختیار کرتا ہے۔ زمین اگر سورج کے گرد چکر لگا رہی ہے تو اس کی کیا ضرورت ہے کہ زمین اور سورج کے درمیان تجاذب کی قوت فرض کی جائے جو زمین کو گھما رہی ہے۔ یہ کیوں نہ کہا جائے کہ سورج کے اطراف مکان۔زمان ایک خاص حالت میں ہے اور مکان۔زمان میں زمین اپنے آسان ترین راستہ پر جا رہی ہے اور قوت تجاذب کا کوئی وجود ہی نہیں۔

اس قسم کی تفصیل و تشریح کے ذریعہ اضافیت کے عام نظریہ کی بنا پر آئن اسٹائن نے جدید تجاذب

کی کو ہم جس کو "قوت" کہتے ہیں، وہ کوئی علیحدہ چیز نہیں بلکہ صرف مکان زمان کی ہی ایک خاصیت ہے۔ کائنات کی ہر شے اپنے گرد و پیش کے مکان ـ زمان میں آسان ترین راستہ (GEODESIC) اختیار کرتی ہے۔ تمام اجسام کی حرکتیں اسی اصول کی بنا پر حاصل کیجا سکتی ہیں اور آئن شٹائن کا یہی قانون ہے جو کہ طبیعیات میں نیوٹن کے قانون تجاذب کی جگہ استعمال کیا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ آئن شٹائن کے نظریہ اضافیت میں یہ بھی بتایا گیا کہ مادہ کی موجودگی مکان ـ زمان کی ... خاصیتوں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ تجربات و مشاہدات نظریہ سے اس امر کی تصدیق کرتے ہیں کہ ... مکان ـ زمان اس قسم کی چیز نہیں ہے جس کو اقلیدس کی جیومیٹری میں مان لیا گیا ہے بلکہ ... مکان ـ زمان کی جیومیٹری "نا اقلیدسی" قسم کی ہے جس میں فیثاغورث کا مشہور مسئلہ صحیح نہیں رہتا۔ چونکہ اقلیدسی فضا کو جس کی جیومیٹری ایک مستوی سطح (PLANE) کی جیومیٹری کے مماثل ہے "چپٹی فضا" کہتے ہیں۔ اس لئے اس نئی نا اقلیدسی فضا (مکان ـ زمان) کو جس کی جیومیٹری ایک کرہ کی سطح کی جیومیٹری کے مماثل ہے، منحنی یا مڑی ہوئی (CURVED) فضا کہتے ہیں اور فضا کا یہ "پیچ و خم" اب ایک مسلمہ سائنسی حقیقت ہے۔

نظریہ اضافیت کے انکشافات سے قبل مکان یعنی فضا کے متعلق خیال کیا جاتا تھا کہ اس کی کوئی انتہا نہیں ہے اگرچہ ہمارے حواس اور تجربے ایک خاص حد سے آگے کی خبر نہیں دیتے۔ لیکن نظریہ اضافیت کی بنا پر آئن شٹائن نے بتایا کہ ..... کائنات متناہی ہے اور اس کے کسی دو نقطوں کا درمیانی فاصلہ معین ہے لیکن چونکہ کائنات کرہ یا گیند کی شکل کی ہے اس لئے اس پر کہیں کوئی حد یا کنارہ نہیں ہے اور جب تک چاہیں اس کے گرد سفر کر سکتے ہیں اسی لئے کائنات کو متناہی (FINITE) مگر غیر محدود (UNBOUNDED) کہتے ہیں۔ یہ نتیجہ فضا کے مڑی ہوئی (CURVED) ہونے کا ایک معمولی نتیجہ ہے۔

آئن شٹائن نے نظریہ اضافیت کی بنا پر یہ ثابت کیا کہ توانائی (انرجی) بھی ایک جمود ... (INERTIA) رکھتی ہے جس کو صرف مادہ سے منسوب کیا جاتا ہے۔ مادہ اور توانائی دو مختلف اشیاء نہیں بلکہ ایک ہی شے کے دو مختلف مظہر ہیں، جن میں ... کی شناخت صرف اسی وقت کی جاتی ہے جب کہ فضا میں کوئی مادہ نہ ہو۔ لیکن اگر کسی شعاع کسی مادی جسم کے قریب سے گذرے تو وہ اپنے سیدھے راستہ سے مڑ جائے گی۔ آئن شٹائن نے ایک فارمولا بھی معلوم کیا جو بتاتا ہے کہ کسی مادی شے سے کتنی توانائی اور کسی توانائی سے کس قدر مادہ حاصل ہوتا ہے۔ مادہ اور توانائی میں کوئی اساسی اختلاف نہیں ہے بلکہ ایک ہی شے کبھی ذرہ کے خواص کا اظہار کرتی ہے اور کبھی موج کے خواص کا۔

زمان و مکان، مادہ اور توانائی جیسے اور قوت جیسے بنیادی تصورات کے بدلنے کی وجہ سے علت و معلول کے منطقی مفہوم میں بھی فرق آگیا ہے۔ نیوٹن کی میکانکس کا ایک اہم مسئلہ یہ تھا کہ اگر کسی شے کی موجودہ حالت معلوم ہو تو اس کی سابقہ یا آئندہ حالت قطعی طور پر متعین ہو جائے گی اور محض قوانین حرکت کی بنا پر علم ریاضی کی مدد سے ازل سے ابد تک اس کی تمام حالتوں کی پیش بندی کی جا سکے گی۔ میکانکس کا یہی مسئلہ تھا جو مادہ پرستوں کے لئے محکم دلیل کا کام دیتا تھا، اور جس کی بنا پر وہ کسی خالق کائنات کے تصور کو غیر ضروری قرار دیتے تھے ..... کیونکہ ان کے نزدیک کائنات کی ہر حالت پہلے سے متعین ہے اور وہ اس کے مطابق خود بخود تشکیل پاتی چلی جا رہی ہے۔

لیکن کوانٹم اور اضافیت کے نظریوں کی بنا پر پروفیسر ہائی زن برگ نے ۱۹۲۷ء میں یہ بتایا کہ مظاہر فطرت میں تعین یا جبر نہیں بلکہ عدم تعین جاری و ساری ہے۔ اس کے بعد سے طبیعی سائنس کا مروجہ اور مسلمہ قانون یہ ہے کہ نہ صرف کائنات بلکہ اس کے کسی حصہ یہاں تک کہ کسی ایک ذرہ کا مستقبل بھی قطعی طور پر متعین نہیں ہے بلکہ وہ کئی ممکنہ حالتوں میں سے کوئی ایک حالت اختیار کر سکتا ہے۔ اس طرح قوانین قدرت تعینی (DETERMINISTIC) نہیں بلکہ احصائی یعنی (STATISTICAL) ہو جاتے ہیں۔

دراصل ہائی زن برگ کے اصول عدم تعین (PRINCIPLE OF INDETERMINACY) ..... کے انکشاف سے قبل ہی بعض مشہور سائنسداں اس امر کا اعتراف کر رہے تھے کہ سائنس کے طریقوں سے اشیاء اور مظاہر کی انتہائی حقیقت یا غایت کو نہ تو دریافت کیا جا سکتا ہے نہ یہ چیز سائنس کے دائرہ عمل میں ہے۔ ۱۹۲۷ء کے بعد سے نیلس بوہر (NEILS BOHR) کے کوانٹم نظریہ میں یکے بعد دیگرے متعدد غلطیاں اور خامیاں منکشف ہونے کے باعث ۱۹۲۷ء میں نئی کوانٹم میکانکس کی بنیاد رکھتے ہوئے ہائی زن برگ اور ڈیراک نے بتایا کہ یہ غلطیاں اس وجہ سے پیدا ہو رہی ہیں کہ سائنس کا مقصد اور اس کا طریقہ کار صحیح طور پر متعین نہیں کیا گیا۔ سائنس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ وہ مظاہر فطرت کی اصلی اور آخری ماہیت اور حقیقت معلوم کرے بلکہ سائنس کا کام صرف یہ ہے کہ ان اشیاء اور مظاہر میں باہمی ربط اور تعلق کا پتہ چلائے۔ ڈیراک نے مثال کے طور پر کہا کہ سائنس میں یہ سوال کرنا بے معنی ہے کہ برق کی حقیقت یا ماہیت کیا ہے بلکہ صحیح سوال یہ ہوگا کہ قوت برق کا عمل کیا ہے۔

اس سے بھی آگے چلئے تو ہم دیکھیں گے کہ سائنس کے اساسی تصورات میں ایک بہت بڑا انقلاب رونما ہوا ہے۔ یہ انقلاب سائنس کے بنیادی قوانین کی تشکیل سے متعلق ہے۔ جیسا کہ عام طور پر معلوم ہے انیسویں صدی کے ختم تک سائنس کے بنیادی قوانین استقرائی (INDUCTIVE) نوعیت کے ہوتے تھے۔ مثلاً قانون تجاذب ہی کو لیجئے۔ یہ قانون کہ کائنات کے کسی دو مادی اجسام یا ذروں کے درمیان ایک معین مقدار کی تجاذبی قوت پائی جاتی ہے خاص مشاہدوں کی مدد سے اخذ کیا گیا تھا۔ اسی طرح برق و مقناطیس کے قوانین، یا روشنی کے منعکس اور منعطف یا منتشر ہونے کے قوانین سب استقرائی تھے۔

لیکن ۱۹۰۵ء اور ۱۹۱۵ء میں آئن شٹائن نے اپنے خاص اور عام نظریہ اضافیت کی تشکیل کے لئے جو قانون یا مفروضے (POSTULATE) اختیار کئے وہ استقرائی نہیں بلکہ "علمیاتی" (EPISTEMOLOGICAL) یعنی فلسفیانہ نوعیت کے ہیں۔ ان مفروضوں کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ قوانین ایسے ہونے چاہئیں جو تمام مشاہدین کے لئے "غیر متغیر" (INVARIANT) یا "ہم تغیر" (COVARIANT) ہوں خواہ یہ مشاہدین کسی قسم کی حالت حرکت میں کیوں نہ ہوں۔ یہ مفروضے جن پر نظریہ اضافیت کی تشکیل کی گئی ہے استقرائی نہیں بلکہ علمیاتی ہیں۔ اسی طرح ہائی زن برگ کا عدم تعین کا اصول جس پر جدید کوانٹم میکانکس کا دار و مدار ہے استقرائی نہیں بلکہ علمیاتی ہے۔

پروفیسر ایڈنگٹن نے سائنس کی اس نئی تحریک کو ایک بڑی دلچسپ مثال کے ذریعہ سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ فرض کرو کہ ایک سائنسداں کسی تالاب سے ایک جال کے ذریعے مچھلیاں پکڑ رہا ہے۔ جب تمام دن کی محنت کے بعد وہ ان مچھلیوں کو جو پکڑی گئی ہیں ناپتا ہے تو بزعم خود ایک قانون کا انکشاف کرتا ہے کہ اس تالاب میں کوئی مچھلی ایک انچ طول سے کم نہیں ہے۔ اس کے اس عمل کو جب کوئی دوسرا شخص دیکھتا ہے تو اس کو بتاتا ہے کہ تمہیں اس قانون کے اخذ کرنے کے لئے تمام دن اتنی محنت کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ تم محض اپنے جال کو دیکھ کر جس کے تمام خانے ایک ایک انچ طول کے ہیں، شروع ہی میں یہ نتیجہ اخذ کر سکتے تھے کہ اس جال سے کوئی ایسی مچھلی نہیں پکڑی جا سکتی جس کا طول ایک انچ سے کم ہو۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ قوانین فطرت کی تشکیل کے لئے علم کی نوعیت اور علم حاصل کرنے کے طریقوں پر غور کر کے استقرائی قوانین کی بجائے مفروضے یا (قوانین) بنائے جا سکتے ہیں ... کوئی استقرائی قانون تو ایک بھی مخالف مثال ... (COUNTER EXAMPLE) کی بنا پر غلط ثابت ہو سکتا ہے جیسا کہ نیوٹن کا قانون تجاذب جس کو اس لئے مسترد کرنا پڑا کہ اس کی بنا پر سیارہ عطارد کا جو مدار محسوب کیا جاتا ہے وہ مشاہدہ کئے ہوئے مدار کے مقابلہ میں غلط ہے۔

طبیعی علوم کی انہی حالیہ ترقیوں کا جائزہ مولانا نے اکابرین سائنس جیسے آئن شٹائن، ... ہائی زن برگ، سر جیمز جینس اور سر آرتھر ایڈنگٹن وغیرہ کی تصنیفوں سے اقتباس کے طور پر پیش کیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ مادیت اور جبر و تعین کا دور اب ختم ہو چکا ہے۔ پھر مشہور فلسفی دے کارت کے فلسفہ شک کو تفصیل سے بیان کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش فرمائی ہے کہ برکلے کے فلسفہ تصوریت (IDEALISM) کو ماننے کے سوا اب کوئی چارہ نہیں رہا۔ ان فلسفوں کے متعلق یہاں کچھ کہنا بے سود اور غیر ضروری ہے کیونکہ حضرت مولانا نے ان کو اس کتاب میں نہایت خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے ایسے ہی ایک موقع کے لئے مولانائے روم فرماتے ہیں ؎

چند گاہی بے نگار آید خوراست
بعد ازاں خود ناف آید رہبر است
(رومی)

بہر حال جب مادیت اور دہریت کے پرستاروں کا وہ طلسم جو انہوں نے سائنس کی بنیادوں پر قائم کیا تھا ٹوٹ گیا تو پھر کائنات کی حقیقت پر غور و فکر کرنے والوں کے لئے بمصداق "کار زخوانی شد نہ یاسلمانی شد" خدا کی ہستی پر ایمان لانے کے لئے نئی راہیں کھل گئیں اور کم از کم ایک برتر آفاقی ذہن (UNIVERSAL MIND) کو تسلیم کرنا ناگزیر ہو گیا۔

حضرت مولانا عبد الباری نے اس حقیقت کو اپنی کتاب میں بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے اور ان اصحاب کے لئے جو سائنس اور بالخصوص طبیعیات کی حالیہ غیر معمولی ترقی سے مرعوب اور متاثر ہو کر ایمان کی کمزوری کا شکار ہو رہے ہیں، یقین محکم حاصل کرنے اور دین و آخرت میں نجات پانے کا سامان مہیا کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ حضرت مولانا کا یہ ایک نہایت اہم اور قابل تحسین کارنامہ ہے۔ جو انہوں نے اس کبر سنی میں اس قدر محنت شاقہ برداشت کر کے انجام دیا ہے۔ اور اس کے لئے وہ یقیناً عند اللہ ماجور اور عند الناس مشکور ہوں گے۔

(مقدمہ کتاب)

حدیث کا تحریری سرمایہ عہد نبویؐ اور عصر صحابہؓ میں!

از محمد علی خان قاسمی، قصبہ رسول آباد، ضلع اناؤ

بعض یورپی مصنفین اور مستشرقین کی ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ صاف و شفاف مذہب اسلام پر شکوک و شبہات کا ایسا گرد و غبار چڑھا کر دنیا کے سامنے پیش کیا جائے جس کی وجہ سے وہ قابل نفرت اور صرف ایک افسانہ بن کے رہ جائے۔ اپنے اس پُر فریب مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے انہوں نے اسلام پر بے شمار افتراءات کئے۔ کبھی انہوں نے یہ باور کرانا چاہا کہ اسلامی کلچر ہر نئے زمانہ کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ کبھی مسلم پرسنل لاء کے معاملے کو بہانہ بنا کر یہ ثابت کرنا چاہا کہ اسلام ایک ناقص دین [illegible] ہے جو ہر نئے زمانے کے ساتھ مطابقت (حرکت) کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ کبھی تعدد ازدواج کا بہانہ بنا کر اسلام کو ظالم قرار دیا اور صنف نسواں کو بیزار کرنے کی ناکام کوشش کی۔ کبھی یہ اعتراض کیا کہ اسلامی فقہ رومن لاء سے ماخوذ ہے اور اس طرح سے فقہ کی اہمیت کو گھٹانا چاہا۔ ان کے اسی طریقہ سلسلہ کی ایک کڑی علم حدیث کو ناقابل تشکیک بنا کر دنیا کے سامنے پیش کرنے کی ہے۔

انگریز اور متعصب پسند اشخاص ڈھونڈ ڈھونڈ کر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ حدیث کا تحریری سرمایہ عہد نبویؐ اور عصر صحابہؓ میں موجود ہی نہیں تھا بلکہ آنحضرتؐ کے سو سال بعد تابعین کے دور میں حضرت عمر بن عبد العزیز کے حکم سے ابن شہاب زہری کے ذریعہ کاغذ کے صفحوں پر آیا۔ بعض کم علموں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ حدیث کی کتابی تدوین امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ کے دور میں ہوئی۔

بہرکیف اپنے مزعومہ باطل کے مطابق انہوں نے حدیث کی صحت و ثقاہت پر شکوک و شبہات کا گرد و غبار ڈال کر ناقابل شک و شبہ بنانا چاہا اور ساتھ ہی اس پر فریب کر کے یہ بھی پروپیگنڈہ کرنا چاہا کہ جس فن اور علم پر سو یا دو سو برس گزر جائیں اور اس کے بعد اس کو تحریری شکل میں لایا جائے تو یقیناً وہ علم کمی بیشی اور تغیر و تبدل اور شکوک و شبہات سے پاک اور مبرا نہیں ہو سکتا۔

اس اعتراض کا اس پُر فریب نظریہ سے کچھ مسلمان بھی متاثر ہو گئے اور نتیجتاً [illegible] حدیث کا انکار کر دیا۔ [illegible] کتابت حدیث کا ایک [illegible] ذرّہ برابر [illegible] ہو سکتا ہے۔

اس مختصر مقالہ میں ان کے اسی وہمی باطل کے تار و پود اور بیخ و بنیاد کو اکھاڑنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ یہ حقیقت آشکارا ہو جائے کہ وہ لوگ کس قدر دھوکہ میں ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ حدیث کی کتابی تدوین پہلی صدی ہجری کے اختتام پر ہوئی۔

یہ حقیقت ہے جس سے چشم پوشی ممکن نہیں کہ ابتداءً آنحضرتؐ نے حدیث کو قید تحریر میں لانے سے منع کر دیا تھا، جیسا کہ آپؐ کا ارشاد ہے۔

من کتب عنی شیئاً غیر القرآن فلیمحہ (جو شخص میری جانب سے قرآن کے علاوہ کچھ لکھے اس کو چاہیے کہ اسے مٹا دے)

قرآن پاک کا نزول ہو رہا تھا، قرآن پاک اور احادیث کے باہمی اختلاط و التباس کا قوی اندیشہ تھا۔ جب یہ اندیشہ ختم ہو گیا اور قرآن پاک لوگوں کے رگ و ریشہ میں خون کی طرح سرایت کر گیا تو آپؐ نے صحابہؓ کو کتابت حدیث کی اجازت بھی دے دی لیکن پھر بھی بعض صحابہؓ نے احتیاطاً حدیث کو جمع نہ کیا۔

اس کے ساتھ ہی اہل عرب تحریری چیز کو معیوب سمجھتے تھے اس لئے جس کے پاس کوئی تحریر ہوتی وہ اسے چھپائے رکھتا تھا۔ اہل عرب زبانی یادداشت کو ہی حفاظت روایات کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ تحریر میں تبدیلی ہو سکتی ہے لیکن دلوں کی تختیوں پر جو نقوش کندہ ہیں ان میں تغیر ناممکن ہی نہیں محال ہے۔ نیز کاتبین کی تعداد کم تھی جیسا کہ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں تصریح کی ہے۔

"لأن أکثرہم کانوا لا یعرفون الکتابۃ"

یہ وجوہ تھے جس کی بنا پر صحابہ کرامؓ حدیث کے اس قیمتی سرمایہ کو کاغذ کے صفحہ پر لانا پسند نہ کرتے تھے۔ لیکن ان اسباب کے ختم ہوتے ہی صحابہ کرامؓ اس جانب متوجہ ہوئے اور حدیث کو کتابی شکل میں لانے کی کوشش کی اور اس طرح سے دور نبویؐ میں حدیث کا سرمایہ قید تحریر میں آ کر فروغ پا گیا۔

حضرت ابوہریرہؓ سے زیادہ آنحضرتؐ کے اقوال و حالات کو بیان کرنے والا کوئی نہیں۔ مختلف روایات سے یہ بات ثابت ہے کہ ان کی روایات اسی دور میں قلمبند ہو چکی تھیں۔

فتح الباری شرح بخاری شریف میں حافظ ابن حجر کے بیان کے مطابق حضرت ابوہریرہؓ اپنی یادداشت کے لئے اپنی روایت کردہ احادیث کو قلمبند کر لیا کرتے تھے۔ حضرت ابوہریرہؓ کے مشہور شاگرد رشید بشیر بن نہیک نے ان کی روایت کردہ حدیثوں کا ایک نسخہ تیار کر کے ان کو سنایا تھا۔

عن بشیر بن نہیک قال کنت أکتب ما أسمع من أبی ہریرۃؓ فلما أردت أن أفارقہ أتیت بکتابہ فقرأتہ علیہ وقلت ہذا ما سمعت منک؟ قال نعم

(تدوین حدیث مولانا مناظر احسن گیلانی)
(بحوالہ دارمی)

(بشیر بن نہیک روایت کرتے ہیں کہ میں جو بات بھی ابوہریرہؓ سے سنتا اسے نوٹ کر لیتا۔ جب میں نے ان کے پاس سے جدا ہونے کا ارادہ کیا تو وہ لکھی ہوئی کتاب لے کر آیا اور حضرت ابوہریرہؓ کے سامنے پڑھی۔ میں نے کہا یہ وہ ہے جو میں نے آپ سے سنا۔ حضرت ابوہریرہؓ نے کہا ہاں!)

حضرت ابوہریرہؓ کی اس تصدیق سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی روایت کردہ حدیثوں کا نسخہ ان کے زمانے میں ہی جمع ہو چکا تھا۔ بشیر بن نہیک کے علاوہ حضرت ابوہریرہؓ کے مشہور زمانہ شاگرد ہمام بن منبہ نے بھی ان کی روایت کردہ احادیث کو جمع کیا تھا اور یہ نسخہ صحیفہ ہمام کے نام سے مشہور ہے۔ یہ صحیفہ شائع بھی ہو چکا ہے۔ احقر کی نظروں سے کتب خانہ دارالعلوم دیوبند میں یہ صحیفہ گزرا ہے۔ ان تاریخی بیانات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ کی مرویات ان کے زمانہ ہی میں قید تحریر میں آ چکی تھیں۔ حضرت ابوہریرہؓ کی طرح دوسرے اکابر صحابہ حضرت عبداللہؓ کی روایتوں کے جمع کئے جانے کا ناقابل انکار ثبوت حدیث کے صفحات میں ملتا ہے۔ خود حضرت ابوہریرہؓ کا بیان ہے۔

عن أبی ہریرۃ یقول ما من أصحاب النبی ﷺ أحد أکثر حدیثاً منی إلا ما کان من عبد اللہ بن عمرو فإنہ کان یکتب ولا أکتب۔ (بخاری شریف جلد ۱ صفحہ ۲۲)

(حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ عبداللہ بن عمرو کے سوا کسی کو مجھ سے زیادہ حدیث یاد نہیں تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ لکھ لیتے تھے اور میں نہیں لکھتا تھا۔)

ابو داؤد شریف کی روایت ہے کہ بعض لوگوں نے حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے کہا کہ آپ ہر بات لکھ لیتے ہیں حالانکہ رسول اللہؐ کبھی غصہ کی حالت میں ہوتے ہیں کبھی خوشی میں ہوتے ہیں اور تم سب کچھ لکھ لیتے ہو۔ حضرت عبداللہ بن عمروؓ نے اس کے متعلق آنحضرتؐ سے سوال کیا:

قلت یا رسول اللہ أکتب کل ما أسمع منک؟ قال نعم، قلت فی الرضا والغضب؟ قال نعم، فإنی لا أقول فی ذلک إلا الحق۔

(ابو داؤد شریف جلد ۲)

(میں نے کہا، اے اللہ کے رسولؐ! میں جو کچھ آپ سے سنوں قلمبند کروں۔ آپ نے کہا۔ ہاں۔ میں نے عرض کیا غصہ اور خوشی دونوں حالت میں؟ آپ نے فرمایا ہاں (پھر آپ نے دہن مبارک کی اشارہ کرتے ہوئے فرمایا) اس منہ سے حق بات کے سوا کچھ نکلتا ہی نہیں۔)

حضرت عبداللہ کی روایتوں کا مجموعہ جو آنحضرتؐ کی حیات طیبہ میں تحریر کیا تھا، محدثین میں صحیفہ صادقہ کے نام سے مشہور ہے۔ ایک دوسرے صحابی حضرت انسؓ جن کا شمار مکثرین میں ہوتا ہے وہ اپنے بیٹوں سے کہا کرتے تھے۔

"یا بنی قیدوا هذا العلم"

(میرے بیٹو! اس علم حدیث کو قلمبند کر لیا کرو)

صرف یہی نہیں بلکہ ان کے شاگرد ابان ان کے پاس بیٹھ کر لکھتے تھے۔

"رأیت أبان یکتب عند أنسؓ"

(تدوین حدیث مولانا گیلانی)

(میں نے ابان کو دیکھا کہ حضرت انسؓ کے پاس بیٹھے لکھ رہے ہیں)

ان بیانات سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت انسؓ کی روایتیں عہد نبوت میں قلمبند ہو چکی تھیں۔

حضرت انسؓ کے صحیفہ کے علاوہ حضرت علیؓ کے صحیفہ کا بھی حدیث کی کتابوں میں تذکرہ ملتا ہے۔ بخاری شریف کی روایت ہے کہ حضرت علیؓ کے پاس ایک صحیفہ تھا جس کو وہ اپنی تلوار کی نیام میں رکھتے تھے اس میں متعدد احکام قلمبند تھے۔

(بخاری شریف جلد ۲)

حضرت جابر بن عبداللہ سے بھی بکثرت روایتیں موجود ہیں۔ ان کی روایات کے قلمبند ہونے کا حال سماعت فرمائیے۔ حافظ ابن حجر کا بیان اگر صحیح ہے تو حضرت جابرؓ کی روایات کے مجموعہ کو ان کے شاگرد وہب بن منبہ نے تیار کیا تھا، اسی طرح دوسرا مجموعہ سلیمان بن قیس نے تیار کیا تھا۔

(تہذیب)

عورتوں میں سب سے زیادہ روایات حضرت عائشہ صدیقہؓ کی ہیں۔ یہ بات تو پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچی کہ خود صدیقہؓ نے اپنی روایتوں کو جمع کیا تھا لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی مرویات ان کے براہ راست شاگرد اور حقیقی بھانجے (لڑکے) حضرت عروہ بن الزبیرؓ کے ذریعہ قلمبند ہو گئی تھیں۔ حضرت عروہؓ نے اپنے علم کو ایک کتاب میں قلمبند کیا تھا جس میں حضرت عائشہؓ کی روایتیں ہونا یقینی ہے۔ واقعہ حرہ میں جب کہ مدینہ لوٹا اور برباد کیا گیا آپ نے اپنی کتاب قصداً ضائع کر دی، بعد کو پچھتاتے ہوئے کہتے تھے،

"لوددت انی کنت فدیتھا باھلی ومالی" (تہذیب ج ۲)

(اچھا ہوتا کہ میں اپنے اہل و عیال کو اس کتاب پر فدا کر دیتا۔)

حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ ایک کثیر الروایۃ صحابی ہیں ان کے متعلق ابن سعد بیان ہے کہ کاتبؓ کے غلام جو ان سے آنحضرتؐ کے کارنامے لکھا کرتے تھے ان کے آزاد کردہ غلام ہے امام ترمذی نے اپنی کتاب (العلل) نقل کی ہے۔

اہل طائف نے بھی حضرت ابن عباسؓ کی حدیثوں کو تحریر کیا تھا جیسا کہ سند بعد ذیل بیان سے واضح ہے۔

"ان نفرا قدموا علی ابن عباس من اھل الطائف بکتب من کتبہ فجعل یقرأ علیھم" (کتاب العلل ترمذی)

اسی طرح سے حضرت ابن عمرؓ کی روایتیں ان کے شاگرد نافع کے ذریعہ سے قلمبند ہونے کا ثبوت ملتا ہے اور امام مالکؒ ان روایتوں کو جو نافع ابن عمر کے ذریعے سے روایت کرتے بعض لوگ انہیں سلسلۃ الذہب قرار دیتے ہیں۔

آنحضرتؐ کے اقوال و افعال کی جن صحابہ کرامؓ نے سب سے زیادہ روایات کی ہیں ان مکثرین صحابہ کی روایات کی تعداد سید سلیمان صاحب ندویؒ نے خطبات مدراس میں بتایا ہے، فہرست پیش خدمت ہے۔

اسمائے صحابی	روایات کی تعداد
حضرت ابو ہریرہؓ	٥٣٧٤
حضرت عبد اللہ بن عباسؓ	٢٦٦٠
حضرت عائشہ صدیقہؓ	٢٢١٠
حضرت عبد اللہ بن عمرؓ	١٦٣
حضرت جابر بن عبد اللہؓ	١٥٤
حضرت انس بن مالکؓ	١٢٨٦
حضرت ابو سعید خدریؓ	١١٧٠

ان مکثرین صحابہ کے علاوہ اور بھی ایسے دور نبوی میں نظر آتے ہیں جن کے پاس حدیث کے مختلف "نوشتے" تھے، اور پھر خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے موقع پر ابو شاہ یمنی کے لئے لکھنے کا حکم صادر فرمایا تھا۔

"اکتبوا لابی شاہ"
(ابو شاہ کے لئے لکھو۔)

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے ارشادات یقیناً قلمبند ہوئے ہوں گے۔ اس کے علاوہ مرض وفات میں آپؐ نے صحابہ کرام سے فرمایا تھا۔

"ائتونی بکتاب اکتب لکم"
(ایک پرزہ لے آؤ میں تمہارے لئے لکھ دوں۔)

اس واقعہ میں کتابت نہیں ثابت ہے۔ لیکن اجازت کتابت سے انکار نہیں کیا جا سکتا اہل یمن کو آپؐ نے کچھ احکام لکھوائے تھے۔ نیز آپؐ کے دعوتی خطوط میں آپؐ کے ارشادات قلمبند ہوتے تھے۔

جب حدیث کا اتنا بڑا تحریری سرمایہ عہد نبوت اور عصر حاضر میں موجود تھا اور بحال سرزمین تحریری سرمایہ ہی قابل اعتبار ہو سکتا ہے۔ تو یہ کہنا کس قدر دھوکا اور علمی افلاس و خفت کا نتیجہ اور تعصب و عناد کا کرشمہ ہے کہ حدیث کی تدوین کا کام سو سال بعد یا امام بخاری علیہ الرحمۃ کے دور میں شروع ہوا۔ اس کے ساتھ ہی اگر صحابہؓ کے حافظہ اور جو اصول نے حدیث کے قبول کرنے کی جو شرطیں بیان کیں یعنی راوی کی زندگی کے پورے حالات اور چھان پھٹک۔ راوی ثقہ ہے یا غیر ثقہ، عاقل ہے یا غیر عاقل اس کی زندگی بے داغ ہے یا نہیں، حافظہ درست ہے یا نہیں — اور تلقی بالقبول کی اور شرطوں کو جو محدثین نے بتائی ہیں ان سب کو بھی دیکھا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ حدیث کا سرمایہ کمی و بیشی اور تقول سے پاک و صاف ہے۔ یقیناً یہ وہی علم ہے جو عصر نبویؐ اور عہد صحابہؓ میں موجود تھا۔

رباعی

دولت کی تمنا ہے تو عالم بن جا
عظمت کی تمنا ہے تو خادم بن جا
جنت کی تمنا ہے تو مسلم بن جا
ذلت کی تمنا ہے تو ظالم بن جا

مسعود بغدادی

اے سرزمین لکھنؤ اے قاہرہ ہمارا!

محترمی خاں یہ عہد کہ

مجھے ندوہ سے دیرینہ قلبی تعلق رہا ہے، اگرچہ میں دارالعلوم دیوبند کا طالب علم ہوں لیکن اپنے کرم فرما حضرت مولانا سید علی میاں صاحب ندوی کی تالیفات اور دروس سے ہمیشہ مستفید ہوتا رہا ہوں اور مسلسل استفادہ کر رہا ہوں نیز ندوہ کا ایک فرزند تصور کرتا ہوں۔

★ ——— کبیر الدین فوزان

گہوارۂ ثقافت۔ تہذیب کا منارا
اے سرزمین لکھنؤ اے قاہرہ ہمارا
علم و ادب کی بستی اے قرطبہ ہمارا
تیرا ہر ایک ذرہ ترے میں ہے ستارا

ہر باغ میں تمہارے بغداد کے نظارے
شاہد ہیں گومتی کے یہ خوشنما کنارے
پیرس و دانش کو ہوتی ہے شرمساری
شام بہشت جیسی ہر شام ہے تمہاری

"دارالعلوم" تیرا علم و ادب کی گنگا
ایمان و دین کا دجلہ شعر و سخن کی جمنا
پیدا کیے ہیں جس نے کتنے ادیب شاعر
عالم، فقیہ و واعظ دانشور و مفکر

"ندوہ" رگوں میں جس کی ازہر کا خون جاری
روح نظامیہ ہے پیکر میں جس کے ساری
دنیا و دیں کا ہے گویا حسین سنگم
یا فکر و آگہی کا شفاف ایک زمزم

یا کارگاہِ دانش ڈھلتے ہیں جس میں انساں
یا جہل کا ہے مقتل یا نشرگاہ ایماں
یہ بوستان شبلیؒ یہ گلشن سلیمانؒ
لوٹی صدا جہاں سے فصل خزاں پشیماں

مہکی ہوئی ہے جس سے دنیائے علم و عرفاں
جشن بہار سے ہے ہر پھول آج فرحاں
آئے ہیں یہ عنادل کھنچ کر یہاں وہاں سے
دل میں پیام لے کر کیا کیا کہاں کہاں سے

ہے یہ دعائے فوزاں قائم رہے خدایا
سید علی میاں کا تا دیر اس پہ سایا

پروفیسر مسعود حسن رضوی سے دو یادگار ملاقاتیں

محمد غفران نشاط رضوی۔ ایم۔ اے

پروفیسر صاحب سے پہلا غائبانہ تعارف ان کی کتاب "ہماری شاعری" سے ہوا جس کے مطالعہ نے اتنا متاثر کیا کہ جیسے ہی کتاب پڑھ کر ختم کی طبیعت بے ساختہ تقاضہ ہوا کہ پروفیسر مسعود حسن صاحب سے ملاقات کی جائے۔ اور ان سے ان کی کتاب کے متعلق تاثرات بیان کئے جائیں لیکن ان کی قیام گاہ [illegible] کرنے والا کوئی نہ ملا۔ بس یہ بات آئی گئی ہوگئی اور خاصہ وقت گزر گیا لیکن "ہماری شاعری" اور اس کے مصنف کا عکس دل میں جاری رہا اور یہ خیال دل میں لئے رہا جب بھی پروفیسر صاحب سے ملاقات ہوگی "ہماری شاعری" سے متعلق اپنے خیالات کا ضرور اظہار کروں گا —

اتفاق کی بات کہئے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ نے ۱۹۶۵ء میں "سوانح مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی صدر یار جنگ" شائع کی یہ سوانح شمس تبریز خاں صاحب نے حضرت مولانا علی میاں صاحب مدظلہ العالی کی نگرانی اور ہدایت کے مطابق تالیف کی ہے چنانچہ مولانا موصوف کا اس پر بہت ہی مبسوط اور جامع مقدمہ بھی ہے — یہ سوانح جب چھپ کر تیار ہوئی تو حضرت مولانا مدظلہ نے لکھنؤ کے خاص خاص لوگوں تک اسے پہنچانے کا حکم فرمایا چنانچہ ان خاص لوگوں میں سے پروفیسر صاحب کی ذات گرامی بھی تھی حضرت مولانا نے فرمایا کہ اپنے ایک خط کے ساتھ اس کتاب کو پہنچا دو۔ تعمیل حکم میں فوراً تیار ہوگیا اور خوشی بھی ہوئی کہ اس بہانے پروفیسر صاحب سے شرف ملاقات حاصل ہوگا لیکن پروفیسر صاحب کی جائے قیام سے اب تک ناواقف تھا، خیر کسی طرح [illegible] صاحب کا گھر معلوم کروں لیکن کوشش اور طلب سے سب کچھ مل جاتا ہے۔ خدا خدا کرکے پروفیسر صاحب کا گھر مل گیا۔ گھنٹی بجا کر بتایا [illegible] اتفاق سے اسی کمرے کے دروازے کھلے تھے جہاں پروفیسر صاحب تشریف فرما تھے معلوم ہوا کہ ابھی ابھی [illegible] کے بعد اندر تشریف لے گئے تھے طبیعت میں اضمحلال اور [illegible] کا احساس ہوا کہ بہت ہی ناوقت آیا [illegible] بیمار ہیں [illegible] اور مجھے [illegible] حکم دیا [illegible]

کتاب "سوانح صدر یار جنگ" ہاتھ میں لے لی اور پھر گفتگو کے دوران [illegible] ہو گئے دل نے کہا اب جانے کی اجازت لینی چاہئے تاکہ پھر آرام کا بھی موقع مل سکے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے [illegible] تھا اس کا سبب یا تو [illegible] گفتگو سے دلچسپی لانے والے کے ساتھ اظہار محبت و مروت [illegible] گفتگو دلچسپ اور پُر از معلومات کہ دل میں پچھتا رہا تھا کہ اس سے بہت پہلے کیوں نہ آئے اور ساتھ ہی ساتھ دل میں یہ بھی خیال کہ پروفیسر صاحب کی گفتگو کے دوران قلم کاغذ بھی ہونا چاہئے ورنہ لکھنؤ کی تہذیب کی زندہ تاریخ کہاں ملے گی، افسوس کے ساتھ اٹھ گیا اور دوبارہ زیادہ وقت لے کر آنے کا عہد کیا —— پروفیسر صاحب کی گفتگو اس قدر مسلسل کہ آدمی خاموشی سے سنتا رہا اور معلومات جمع کرتا جائے۔

جاتے ہی وقت پروفیسر صاحب کے ہاتھ میں "سوانح" پیش کی تو دل میں خیال آیا کہ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی صدر یار جنگ جیسے پڑھے لکھے اور وہاں آدمی [illegible] ناواقفیت کا تو کوئی سوال نہیں، لہٰذا میں نے یہ دریافت کیا کہ کیا آپ کی بھی ملاقاتیں مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی سے ہوئی ہوں گی، فرمانے لگے ہاں ۱۹۲۱ء میں وہ لکھنؤ آئے ہوئے تھے۔ [illegible] کوٹھی میں قیام تھا، میں وہاں ان سے ملا تھا اور انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا کر رہے ہو؟ میں ان دنوں مراثی انیس ایڈٹ کر رہا تھا کہا کام تو بڑا اچھا ہے لیکن مرثیوں کے ان مضامین پر خصوصی طور پر تنقیدی نظر ڈالنے کی ضرورت ہے جہاں مصائب اہل بیت کے بیان کرنے میں اہل بیت کے منصب اور شان کا لحاظ نہیں کیا گیا۔

پروفیسر صاحب نے نواب صدر یار جنگ کی بات جب ختم کی تو میری زبان بھی اس طرف متوجہ ہوگئی کہ کہاں یہ حضرات اہل بیت جن کا مرتبہ اور مقام [illegible] اور کہاں یہ [illegible] بے شک ایسی [illegible] سے ان حضرات کے اعلیٰ اور پاکیزہ کردار مجروح ہو جاتے ہیں۔

پروفیسر صاحب نے مجھ سے یہ فرمایا کہ نواب صدر یار جنگ [illegible]

"مراثی انیس" کے کچھ بند پڑھ کر سنائے اور کہا اس میں [illegible] کا جو پہلو [illegible] سے ان حضرات اہل بیت کی شان اور وقار [illegible] ہوتا ہے۔

اس ملاقات کے بعد ایک طویل وقفہ ہوا یہاں تک کہ حضرت مولانا علی میاں صاحب مدظلہ کا سفرنامہ "دریائے کابل سے دریائے یرموک تک" جولائی ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا حضرت مولانا نے اس سفرنامہ کو بھی مخصوص حضرات کے پاس بھجوانے کی تاکید کی چنانچہ اس کے طفیل میں پروفیسر صاحب سے دوبارہ ملاقات کا شرف حاصل ہوا، کتاب کا میں نے سرسری تعارف کرایا، کتاب کے اوراق الٹ پلٹ کر دیکھنے لگے سفرنامہ کا وہ حصہ جو ایران سے متعلق ہے اس کی سرخی کو بہت محظوظ ہو کر پڑھا "ذوق جمال، فانی خیال کی سرزمین ایران" پھر اپنے سفر ایران کے واقعات دہرانے لگے اور کہا کہ ضرور اسے پڑھوں گا اور دیکھوں گا کہ جس وقت میں نے ایران کا سفر کیا تھا اس وقت سے اب تک کیا فرق ہوا، بہت سے تاریخی مقامات اور شخصیات کا ذکر کیا۔

پروفیسر صاحب کا بہت ہی خاص اور پسندیدہ موضوع میر انیس کا کلام تھا۔ میں نے "موازنہ انیس و دبیر" کا ذکر کیا فرمانے لگے علامہ شبلی کا بڑا احسان ہے انہوں نے اس کتاب کو لکھ کر ان لوگوں کے خیال کو بدل دیا جو میر انیس کو صرف ایک خاص مذہبی فرقہ کا شاعر سمجھتے ہیں۔ کچھ دیر تک میر انیس ہی موضوع رہے اُن کے منتخب اور چیدہ اشعار بڑے مزے لے لے کر [illegible] پڑھ کر سنائے۔ فرمانے لگے کہ میر انیس جس وقت اپنا کلام پیش کرتے اور اس میں منظر کشی کا موضوع ہوتا تو سامعین کی آنکھوں کے سامنے وہ منظر آجاتا۔ پھر اس کے بعد پروفیسر صاحب مجھے لے کر ایک بڑے ہال میں گئے اور وہاں وہ کتبات دکھائے جو میر انیس کے مزار اور قبر پر لگوائے جانے تھے۔

میر انیس کے علاوہ ان کا دلچسپ موضوع واجد علی شاہ تھا۔ پروفیسر صاحب نے ان کا [illegible] کی جس سے واجد علی شاہ کی شخصیت [illegible] ہو جاتا ہے۔ انہوں نے واجد علی شاہ کو ایک [illegible] کی حیثیت سے پیش کیا ہے [illegible] نے اس سلسلہ میں [illegible] کی کتاب [illegible] ذکر کیا [illegible]

پروفیسر صاحب نے اس بات پر زبردست تنقید کی کہ اس کو بری طرح سے [illegible] کیا گیا ہے [illegible] "مرثیہ [illegible]" میں شائع ہے [illegible] ایسے شخص کا کیا اعتبار ہو [illegible] جاہل ہے۔ میں نے اُن کی ناگواری کی خاطر گفتگو کا رخ دوسری طرف پھیر دیا [illegible] شیعہ میں [illegible] سب سے زیادہ مولانا علی نقی کے معتقد اور قائل تھے [illegible] جلسہ [illegible] مولانا سید علی نقی کی شخصیت حضرات شیعہ کے مابین مختلف فیہ ہے، ایک جماعت ان کی مخالف ہے دوسری موافقت میں — معلوم ہوا کہ لکھنؤ کا شیعہ حضرات کا اختلاف اس بارے میں [illegible] ایران کو اس میں دلچسپی ہوتی [illegible] معلوم نہیں یہ اختلاف اب تک دور ہو سکا یا نہیں؟

چونکہ پروفیسر صاحب سے دیر تک گفتگو ہوتی رہی [illegible] اور جب واقعہ کو سناتے پوری تفصیل کے ساتھ [illegible] سناتے کوئی بات [illegible] بار بار نسیان اور قوت حافظہ کی شکایت کرتے اور کہتے کہ اب دماغ کام نہیں کرتا ہے۔ اس ملاقات میں بھی پہلی ملاقات کی طرح معذرت کے ساتھ میں نے اجازت مانگی اور اس خیال کے ساتھ [illegible] کہ ان صاحب کے پاس اطمینان کے ساتھ زیادہ وقت لے کر آنے کی ضرورت ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ ان سے استفادہ کیا جا سکے۔ چلتے وقت میں نے عرض کیا کہ اس سفرنامہ کے سلسلہ میں حضرت مولانا علی میاں صاحب مدظلہ کو آپ کے تاثرات اور خیالات کا انتظار رہے گا۔ پروفیسر صاحب نے میرا نام اور پتہ دریافت کیا اور کہا لکھ دو چنانچہ میں نے لکھ دیا اس کے بعد مجھے بار بار انتظار رہا کہ اس کتاب کے سلسلہ میں پروفیسر صاحب کا تبصرہ دیکھنے کو ملے گا لیکن افسوس طویل انتظار کے باوجود تبصرہ دیکھنے کو نہ ملا یہاں تک کہ دسمبر ۱۹۷۵ء میں پروفیسر صاحب کا وقت موعود آگیا اور وہ عالم فانی سے عالم باقی کی طرف انتقال فرما گئے۔

اس بات کا [illegible] احساس ہے کہ وہ دونوں کتابیں جو حضرت مولانا مدظلہ کی طرف سے پروفیسر صاحب کو پیش کی گئیں [illegible] تبصرہ یا اظہار خیال [illegible] ان کی [illegible] کی اطلاع حضرت مولانا کو [illegible] کے ساتھ واپس ہوا [illegible] پہلے مرحلہ [illegible] دوسرے مرحلہ [illegible] پہنچ گیا۔

اسلام اور وطنیت

[illegible]

تاریخ کے مختلف ابواب پر نظر ڈالنے کے بعد یہ حقیقت آشکارا ہوتی ہے کہ وطنیت [illegible] اور قومیت کا جذبہ بیزاری [illegible] اور جغرافیائی تقسیم کا زیادہ تر [illegible] حقیقت مغربی نظریات کا خاصہ ہے جو مغربی نسل میں برابر منتقل ہوتی رہی ہے لیکن اسلام کو اس نظریہ سے دور کا بھی رشتہ نہیں ہے کیونکہ اسلام نہ کسی ایک وطن کے لئے آیا ہے نہ کسی خاص ملک کے لئے، نہ کسی خاندان کے لئے اور نہ کسی خاص ذات و جماعت کے لئے، بلکہ اسلام ایک ہمہ گیر و عالمگیر مذہب ہے، یہ ساری دنیا کے لئے آیا ہے۔

بالکل یہی حیثیت مومن اسلام کی بھی ہے کیونکہ ساری کائنات خدا کی ہے اور مومن بھی خدا کا خلیفہ ہے، لہٰذا ساری کائنات مومن کا اپنا وطن ہے جیسا کہ وعدۂ خداوندی ہے: "وعد اللہ الذین آمنوا منکم وعملوا الصالحات لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم" اس آیت کریمہ کے اندر مالک کائنات کی طرف سے تمام روئے زمین مومن کی وراثت ہونے کا اعلان صریح ہے، اسی آیت کے پیش نظر حکیم مشرق و مغرب اقبالؒ یوں نغمہ سرا ہوا:

مومن کے جہاں کی حد نہیں ہے
مومن کا مقام ہر کہیں ہے

نیز حدیث کے پیش نظر یوں گویا ہیں:

ہو قید مقامی تو نتیجہ ہے تباہی
رہ بحر میں آزاد وطن صورت ماہی
ہے ترک وطن سنت محبوب الٰہی
دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی
گفتار سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشاد نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

اقبال کی نگاہ میں مومن کی حیثیت ایک عالمی حقیقت ہے، رنگ و نسل اور ملک و وطن کی جغرافیائی حدود میں اسے پابند نہیں کیا جا سکتا، وہ مکان و زمان کی حدود سے ماوراء ہے، چنانچہ اسی خیال کو ایک مقام پر یوں نظم کرتے ہیں:

[illegible] حدود و آفاق سے شعور
ایک نقطہ کی سرحد [illegible]
اسی کے [illegible] غریب
[illegible] پیام [illegible]
[illegible] ذوق [illegible] شوق

یہی وجہ ہے کہ اقبال جیسے [illegible] مغرب کی دولت وطنیت پر اقبال بھی یہ صدا بلند [illegible] کس قدر حملہ آور ہے:

درویش خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند

نیز تاریخ کے صفحات اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ وطنیت مسلمانوں کے مذہبی روایات کے سراسر منافی ہے۔

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جب ہم عہد رسالت و اسلامی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو مجاہدین اسلام کی ایک طویل از طویل قطار وطنیت سے بالکل بیگانہ و برطرف، صرف اسلامی رنگ میں نظر آتی ہے، مثلاً اسپین کا وہ ساحل جہاں ایک جانباز سپہ سالار طارق ابن زیاد واپسی کی اپنی تمام کشتیوں کو نذر آتش کر کے گویا زبان حال سے گویا نظر آتا ہے۔

"ہمارا دیار و وطن کسی ملک کا کوئی گوشہ یا کوئی ملک نہیں کہ ہم پھر دوبارہ وطن، فرقت اہل و عیال اور خوف جان کے خطروں کے شکار ہوں بلکہ دنیا کا ہر جز خواہ وہ خشکی ہو یا تری ہمارا وطن اور ہمارا ملک ہے۔"

خندید و دست خویش بہ شمشیر برد و گفت
ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست

اسی طرح اسلامی تاریخ کے درخشاں ابواب سعد بن ابی وقاص، خالد بن ولید، مثنیٰ بن حارثہ، عقبہ ابن عامر، محمد بن قاسم اور فاتح عظیم افریقہ طارق و موسیٰ بن نصیر وغیرہ کے اسمائے گرامی تاریخ اسلام کے لئے ہمیشہ قابل فخر اور وطنیت و قومیت کے اوپر ہمیشہ ضرب کاری رہیں گے۔

البتہ اس بحث میں یہ اعتراض ضرور پیش آتا ہے کہ جب وطنیت اور قید مقام سے اسلام کو کسی طرح کا کوئی واسطہ نہیں ہے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے وطن مکہ سے محبت کس بنا پر تھی اور آنحضرتؐ نے ہجرت فرماتے وقت جوش الفت سے بیتاب ہو کر کیوں فرمایا تھا:

واللہ انک لاحب ارض اللہ الی وانک لاحب ارض اللہ الی اللہ ولولا ان اھلک اخرجونی منک ما خرجت۔

یعنی (اے سرزمین مکہ) تو مجھے خدا کی تمام روئے زمین میں سب سے زیادہ محبوب ہے اور خدا کے نزدیک بھی تو تمام روئے زمین سے زیادہ محبوب ہے، اگر تیرے باشندے مجھے تجھ سے نہیں نکالتے تو میں نہیں نکلتا۔

پھر جبکہ وطن انسان کا ایک اصلی جذبہ اور فطری تقاضہ ہے کہ وہ اپنی جائے پیدائش سے محبت کرے تو پھر وطنیت کو مذموم قرار دینا کیونکر درست ہو سکتا ہے؟

یہ اعتراض اگرچہ فطری ہے لیکن حقیقت کو دیکھنے کے بعد پھر اس کی کوئی حیثیت نہیں رہ جاتی۔ شاعر مشرق علامہ اقبالؒ نے جاوید نامہ میں اس اعتراض کا نہایت ہی لطیف اور معقول جواب یوں نظم کیا ہے:

با وطن اہل وطن را نسبت است
زانکہ از خاکش طلوع ملت است
اندریں نسبت اگر داری نظر
نکتہ بینی ز مو باریک تر
گرچہ از مشرق برآید آفتاب
با تجلی ہائے شوخ و بے حجاب
در تب و تاب است از سوز درون
تا ز قید شرق و غرب آید برون
بر دمد از مشرق خود جلوہ مست
تا ہمہ آفاق را آرد بدست
فطرتش از مشرق و مغرب بری است
گرچہ او از روئے نسبت خاوری است

ذکر کردہ اعتراض جس قدر اہم ہے اسی لحاظ سے حضرت اقبال کے اس اسلوب و انداز سے جواب بھی [illegible] ہے۔ اس نظم میں آفتاب کی جو مثال پیش کی گئی ہے وہ اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک ایسی موثر اور نادر مثال ہے کہ اس سے مطلوبہ بحث کا کوئی خفیف سے خفیف پہلو بھی فوت نہیں ہے۔ فرماتے ہیں کہ آفتاب اگر مشرق سے طلوع ہوا کرتا ہے اور اس بنا پر مشرق سے اس کو ایک طرح کی نسبت بھی ہے لیکن فیض رسانی اس قدر عام اور وسیع ہے کہ اس کی وجہ سے وہ ہر قسم کی حد بندی اور مقامی خصوصیت یعنی مشرقی خصوصیت سے بالکل مستغنی ہو جاتا ہے۔۔۔۔ بالکل اسی طرح اگرچہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام اور صحابۂ کرامؓ کو اپنے وطن مکہ سے محبت و نسبت تھی لیکن مانند آفتاب ان کا فیض روحانی بے حد عام اور وسیع تھا، اسی کی وجہ سے وہ ہر قسم کی حد بندی اور مقامی خصوصیت سے بالکل مستغنی ہو جاتے ہیں، اور اسلام کے اندر وطنیت کی تردید ہو جاتی ہے اور اسی کے خلاف اسلامی جذبات اقبالؒ کی آواز میں یوں گونج اٹھتے ہیں:

[illegible]
[illegible]

وطنیت کی مذمت کے لئے یہ تاریخی شہادت کافی ہے کہ امت مسلمہ کی عالمگیر اخوت اور قومی وحدت کو [illegible] پارہ پارہ [illegible] آج بھی [illegible] دل کو مجروح کر دیتا ہے۔

دور نہ جائیے صرف چند ہی سال کے فاصلہ پر بنگلہ دیش میں جذبۂ وطنیت و قومیت نے جو [illegible] سقوط بغداد [illegible] کی بربریت اور ظلم و ستم کی تاریخ [illegible] اگر تاریخ کے صفحات

جذبۂ وطنیت و قومیت کے ایسے ہی نتائج جب پڑھے ہیں تو پھر وہ کون سا پہلو ہے جو تحسین وطنیت و قومیت کی ضمانت دیتا ہے۔

وطنیت و قومیت کے انہی نتائج کے پیش نظر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اسلام میں ان کی سخت مذمت فرمائی اور انہیں صدائے جاہلیت قرار دیا ہے۔ مثلاً ایک انصاری اور مہاجر میں جھڑپ ہو گئی، انصاری پکارا "یا للانصار" یعنی اے انصار دوڑو، اور مہاجر نے آواز دی "یا للمہاجرین" جب آپؐ نے یہ آواز سنی تو فرمایا "[illegible] دعوھا فانھا منتنۃ" یعنی یہ صدائے جاہلیت کیسی؟ اس خباثت کو چھوڑو۔

اس موضوع پر یہ بات ضرور پیش نظر رہنی چاہئے کہ ہمارے درمیان کی آواز Patriotism (حب الوطنی) اگر نفرت و تعصب اور قومیت سے پاک ہو، جو اوروں کے اندر صرف اپنے ساتھ ہمدردی اور ملک و وطن کی فلاح و بہبودی کے جذبات پیدا کرتا ہو تو پھر اسلامی نقطۂ نظر سے یہ قابل مذمت نہیں ہے۔ البتہ اس کی مذمت اس وقت ضرور لازم آتی ہے جب اس لفظ سے [illegible] جیسی حب الوطنی مراد لی جائے، کیونکہ ان کی حب الوطنی اپنی اصل حد سے تجاوز کر کے تعصب و قومیت کے خطرناک نتائج کی شکل میں پہنچ چکی ہے۔

آج بھی ان پر تعصب و قومیت کا غلبہ اس قدر ہے کہ وہ تہذیب و تمدن اور انسانی محبت و مساوات کے دعوے کے باوجود بھی اپنے آپ کو فوقیت و امتیاز کا تمغہ عطا کر رہے ہیں۔ ایشیائی قوموں کو اپنے مقابلے میں اس قدر حقیر و ہیچ سمجھتے ہیں کہ ان کے ساتھ بیٹھنا اور سفر کرنا بھی اپنی توہین اور کسر شان سمجھتے ہیں، اس سلسلہ میں گاندھی جی کا وہ واقعہ مشہور ہے جو انہیں South Africa (جنوبی افریقہ) میں پیش آیا تھا، جب انگریزوں نے گاڑی کے ڈبے سے Blackman کہہ کر نہایت ذلت کے ساتھ نکال باہر کر دیا [illegible] پلیٹ فارم پر ٹھٹھرتے رہے۔

ان کا سوانح نگار لکھتا ہے:

So he just sat and shivered in the dark waiting room, without a friend, alone in this strange, unkind land.

وطن پرستی اور [illegible] انسانی [illegible] حب الوطنی [illegible] اس کی [illegible] مرتبہ [illegible] ہیں۔

••

نفس کی غلامی

ایٹم بم سے زیادہ ہلاکت خیز اور تباہ کن

مترجمہ: سید شکیل حسین، متعلم عربی ندوہ

[illegible] حضرت مولانا [illegible] ندوی صاحب [illegible] کا ایک مضمون [illegible] جو مکہ مکرمہ سے شائع ہونے والے عربی ماہنامہ "رابطة العالم الاسلامی" میں چھپا تھا۔

اس دنیا میں آج جو زندگی بسر کر رہے ہیں ان کا مختلف شکلوں اور متفرق صورتوں میں ہونا [illegible] ان میں سے ہر ایک کا ایک مخصوص نام ہے مثلاً مشرقی زندگی، مغربی زندگی، اسی طرح اشتراکی زندگی اور قدامت پرست یا مادہ زندگی، اسکے علاوہ بھی بہت سے نام اور اصطلاحات رائج ہیں۔

لیکن درحقیقت زندگی کی صرف دو ہی قسمیں ہوتی ہیں، کوئی تیسری قسم نہیں۔ ایک قسم کی زندگی وہ ہے جو نفس کی غلامی پر قائم ہو، دوسری وہ جس کی اساس و بنیاد اللہ کی عبادت پر ہو۔ ان دو قسموں کے علاوہ زندگی کی دوسری تمام قسمیں یا تو ان کی شاخیں ہیں یا جزء۔

تو جس زندگی کی بنیاد نفس کی عبادت اور غلامی پر ہوتی ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان نفس کا بندہ اور شیطان کا غلام ہو کر رہ جاتا ہے، زندگی ہر قید و بند سے آزاد اور بے لگام ہو جاتی ہے۔

دوسری وہ زندگی جس کی اساس اللہ کی عبادت اور ایمان پر ہوتی ہے، یہ وہ زندگی ہوتی ہے جو اپنے خالق پر ایمان و اعتقاد رکھتی ہے اور اپنی مرضی میں اللہ کے ارادہ اور اس کے حکم پر راضی ہوتی ہے، وہ پورے طور پر یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ صرف اللہ کی ذات ہی ایسی ہے جو اس کے فائدوں اور ضرورتوں سے باخبر ہے، کائنات میں اس خدا کے علاوہ کوئی ذات ایسی نہیں جو اس سے زیادہ اس کی منافع و ضروریات سے واقف ہو، یہ ہے کہ خدائے واحد و لاشریک کی اسی بندگی ہے جس نے انسان کے لئے اصول و قوانین نازل فرمائے [illegible] اور زندگی [illegible] کا قیام اس کے بغیر ممکن نہیں۔

انبیاء علیہم الصلوٰۃ والتسلیم صرف اسی لئے مبعوث فرمائے گئے کہ وہ لوگوں کو تنہا ایک خدا کی بندگی کی دعوت دیں، اور جب بھی کوئی نبی دعوت دیتا [illegible] اللہ کی عبادت [illegible] کی غلامی پر [illegible] نفس کی عبادت [illegible] ابھری۔ [illegible] تو اس کی تاثیر میں اضافہ ہوا اور وہ غالب آ گئی۔

افسوس کا مقام یہ ہے کہ آج کے اس دور میں نفس کی غلامی کا پورے طور پر تسلط ہو گیا ہے حتیٰ کہ زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس پر نفس کی غلامی کا غلبہ اور تسلط نہ ہو۔ بازاروں میں، دفتروں میں، کارخانوں میں ہر جگہ اسی کی حکومت ہے گویا کہ وہ ایسا بحر زخار ہے جس کی موجیں ہر طرف [illegible] کو نگلے جا رہی ہے۔

کیا آپ جانتے ہیں کہ غلامی نفس کا بازار کیوں گرم ہوا اور کس چیز نے اس کو پسندیدہ و مقبول بنایا؟ اس کی مقبولیت و پسندیدگی کی وجہ صرف جلد حاصل ہونے والی لذت ہے۔

ہم اس لذت و آرام کا مخالف نہیں ہوں جس سے انسان اپنی زندگی میں لطف اندوز ہوتا ہے بلکہ جلد حاصل ہو جانے والی لذت کی فکر اور اس میں مست ہو جانے کا میں مخالف ہوں اور یہ ایک غلط فکر ہے، یہی ہے وہ فکر جس نے لوگوں کے لئے طرح طرح کی مشکلات و مصائب کو جنم دیا اور یہی چیز دنیا میں ہلاکت، تباہی و بربادی خیز فتنوں کا سبب بنی اور اگر لوگ اس غلط فکر کے پرستار نہ ہوتے تو صورت حال ویسی نہ ہوتی جس کا آج ہم مشاہدہ کر رہے ہیں۔

اے مسلمانو! تم نے نفس کو لائق عبادت اور قابل پرستش بنا کر اپنے اوپر ظلم کیا ہے جبکہ تمہارا فریضہ تو یہ تھا کہ تم صرف اللہ کی عبادت کرتے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرتے اور یہ کہ تم تمام لوگوں کو اللہ کی عبادت کی طرف بلاتے۔ یہاں تک کہ تم دنیا میں مثالی مسلمان کی زندگی کا کامل نمونہ بن جاتے لیکن تم نے تو نفس کی غلامی کو اللہ کی عبادت پر ترجیح دی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تم دنیا و آخرت دونوں جگہ گھاٹے میں رہے بلکہ دوسروں کے خسران و نقصان کا سبب بنے اور اگر تم [illegible] اس فریضہ کو ادا [illegible] عبادت [illegible] ہو جاتی، [illegible]

آج کی سب سے بڑی مصیبت و مشکل یہ ہے کہ جو لوگ سیاست و تدبر میں نمایاں نظر آتے ہیں ما شاء اللہ وہی نفس کے سب سے بڑے پجاری ہیں، دنیا اور ناکام قومیت کے فریب میں مبتلا ہو کر دنیا کو تباہ کرنے پر تُل گئے ہیں اور ان کے پیروکار برابر ان کے نقش قدم پر بڑھے چلے جا رہے ہیں۔

یقین جانو کہ نفس کی غلامی ایٹم بم سے زیادہ ہلاکت خیز و تباہ کن ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ ان ایٹمی بموں کا تذکرہ آتے ہی تم غیظ و غضب میں بھر جاتے ہو اور کہنے لگتے ہو کہ جلد ہی یہ بم دنیا اور اس کے رہنے والوں کو مکمل طور پر تباہ و برباد کر ڈالیں گے لیکن میں کہتا ہوں کہ ان بموں پر غصہ نہیں آنا چاہئے ان کا کوئی قصور نہیں۔ اصل مجرم تو ان کا موجد ہے بلکہ وہ ادارے اور حکومتیں ہیں جنہوں نے انسان کو اس ہلاکت خیز چیز کی ایجاد پر مجبور کیا۔ حقیقتاً جرم تو انہیں کا ہے۔ پھر یہ کہ ایٹم بم ہے کون اور وہ اس تمدن کے ظاہر ہونے کا سبب وحید نفس کی غلامی اور شیطانی زندگی ہے۔

یہی کشتی ملت کے ناخدا ہونگے

عربی مدارس کے قیام کی سب سے بڑی غرض یہ تھی کہ یہاں دین و ملت کے ایسے سپاہی تیار کئے جائیں جو ہر حال میں اسلام کی حفاظت کر سکیں اور الحاد و بے دینی کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روک سکیں۔ آغاز کار کے وقت ان درسگاہوں نے اس دور زمانہ کے حالات کے مطابق مفید و مؤثر لائحہ عمل تیار کیا تھا اور نصاب و نظام تعلیم کے ایسے خاکے بنائے تھے جو اس وقت کی ضرورت کے مطابق تھے، بیشک وہ جب تک قائم رہے یہ نظام تعلیم مفید اور کارگر ثابت ہوا لیکن اب جب کہ عرصے سے حالات بدل چکے ہیں ضرورت ہے کہ ہماری درسگاہوں میں بھی انقلاب ہو، زمانہ کی نئی ضرورتوں کے مطابق پھر سے نصاب تعلیم مرتب ہو اور تعلیم و تربیت کے ایسے اسلوب اختیار کئے جائیں جو طلبہ کو وقت کی ضرورتوں کے مطابق زندگی کے نئے میدانوں کے لئے تیار کر سکیں، یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ آج کے طلبہ کل کے علماء ہونگے، قوم کی باگیں ان کے ہاتھ میں ہوں گی اور یہی کشتی ملت کے ناخدا ہونگے۔

اسلام دوسرے مذاہب کی طرح صرف چند عقائد اور عبادتوں تک محدود نہیں بلکہ زندگی کے تمام گوشوں پر محیط ہے، دین و دنیا کی [illegible] تفریق کی اسلامی تعلیم میں کہیں گنجائش نہیں، ضرورت ہے کہ اسلامی تعلیم گاہوں کا نصاب [illegible] ترتیب دیتے وقت یہ حقیقت پیش نظر رہے تاکہ آئندہ کوئی بنیادی غلطی نہ ہونے پائے اور ایسے تعلیمی مرکز قائم ہو سکیں جو دین و دنیا کی جامعیت کے نمونے ہوں، آج جو خطرے [illegible] ہیں ان کا تدارک اگر ممکن ہے تو صرف اسی وقت جب کہ ہم اس بنیادی سوال کو حل کر لیں اور اس اصول کی روشنی میں اپنے مدارس پر ایک اصلاحی نظر ڈالیں۔

یہ باتیں عرصہ سے ہو رہی ہیں، اب شاید مشکل ہی سے کوئی حلقہ ایسا ہو جو حالات کی نزاکت کو محسوس نہ کرتا ہو اور اس کے تدارک کے لئے بیقرار نہ ہو، ضرورت ہے کہ یہ باتیں اب عمل کا قالب اختیار کریں اور خیالی خاکوں میں حقیقت کا رنگ بھرا جائے۔ دین و ملت کے خدمت گزار کسی جگہ جمع ہوں، جزوی اور فروعی اختلافات نظر انداز کر کے مستقبل کی فکر کریں اور آنے والے خطرات کے پیش نظر ایک نئی تنظیم اور ایک نئے اتحاد کی بنیاد ڈالیں، جہاں تک ندوہ کے خادموں کا تعلق ہے وہ ہمیشہ کی طرح آج بھی اتحاد و تعاون کے لئے تیار ہیں اور اپنی بساط کے مطابق ہر خدمت کے لئے حاضر ہیں۔

(مولانا سید [illegible] ندوی [illegible])

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی عازم سفر حجاز و لندن

ناظر ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ حجاز تشریف لے گئے ہیں [illegible] وہاں [illegible] اپریل تک قیام رہے گا۔ [illegible] اپریل کو وہ لندن تشریف لے جائیں گے جہاں [illegible] حضرت مولانا مدظلہ کی واپسی ان شاء اللہ [illegible] ہوگی۔

حضرت مولانا مدظلہ کے ہمراہ [illegible] ندوی ہیں۔

[illegible] ندوہ [illegible] شائع کیا۔

[illegible]

Regd. No. L. W/NP 56 FORTNIGHTLY Phone : 22948

TAMEER-E-HAYAT

Daruluioom Nadwatululama, Lucknow (India)

قارئین "تعمیر حیات" سے

(۱) — جن حضرات کا زر سالانہ ختم ہو گیا ہے وہ از کرم رو چندے کی رقم بذریعہ منی آرڈر جلد روانہ فرمائیں۔

(۲) — مسلسل خسارہ کی وجہ سے بلا قیمت اعزازی پرچہ جاری کرنا دشوار ہو گیا ہے۔ اعزازی قارئین سے گذارش ہے کہ وہ جس قدر ممکن ہو بذریعہ منی آرڈر روانہ کر کے ادارے کی اعانت فرمائیں۔

(۳) — ڈاک، پی کے مصارف میں خاصا اضافہ ہو گیا ہے، لہٰذا وی پی کا انتظار نہ فرمائیے

(منیجر)

ایکو

دورِ حاضر کی بہترین گھریلو دوا

نورانی تیل

ہر قسم کے جسم کے درد چوٹ۔ زخم۔ جلے کٹے کی بہترین دوا

انڈین کیمیکل کمپنی۔ بیرون محمد گنج (یو۔پی)

"تعمیر حیات"

پچاس ہزار ہاتھوں تک پہونچتا ہے۔

"تعمیر حیات"

میں اشتہار دے کر

اپنی تجارت کو

فروغ دیجئے۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی

نئی تصانیف

جب ایمان کی بہار آئی: رائے بریلی کی تربیت گاہ سے بالاکوٹ کی شہادت گاہ تک ایمان و یقین، اسلامی اخلاق اور جہاد و قربانی کی مدوجہ پرور داستان۔ شروع میں سید احمد شہیدؒ کا شجرۂ نسل۔ اس کا جدید نسخہ اور اثر انگیز واقعات، اعلیٰ کتابت و طباعت دیدہ زیب سرورق

قیمت، بارہ روپے

پرانے چراغ: ملی زندگی کے مختلف شعبوں کے چند نامور اور ارباب علم و دانش کے حالات و سوانح اور کارناموں کا ایک دلآویز و دلکش علمی مرقع جس کو پڑھ کر روح میں بالیدگی پیدا ہوتی ہے۔

قیمت، سولہ روپے

تعدد ازدواج: اس اہم مسئلہ پر ایک عرب فاضل شیخ عبدالعزیز الفقالی کی تحریک قرآن حکیم اور عقل سلیم کی روشنی میں۔ قیمت صرف ایک روپیہ ۲۵ پیسے۔ انگریزی ڈیڑھ روپے

ذکرِ خیر: مولانا ندوی کی والدہ ماجدہ کے مؤثر حالات زندگی جو سب کے لئے یکساں مفید و سبق آموز ہیں۔

قیمت صرف تین روپے

مکتبۂ فردوس مکارم نگر (برولیا) لکھنؤ ۳

معدہ، جگر، اعصاب اور گردوں کو طاقت دیتی ہے۔

بیماری کے بعد کی کمزوری کو جلد دور کرتی ہے۔

دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

قابلِ توجہ

"تعمیر حیات" کی قیمت لاگت سے بہت کم رکھی گئی ہے، تاکہ زیادہ سے زیادہ حضرات مستفید ہو سکیں۔ اسلئے اہلِ استطاعت حضرات سے پُر زور گذارش ہے کہ حوصلہ مندی سے عطیات عطا فرما کر دینی لٹریچر کی نشر و اشاعت اور ادارہ کی اعانت میں حصہ لیں۔ ان حضرات کی خدمت میں "تعمیر حیات" برابر ارسال کیا جائے گا۔

(منیجر)

رانا ٹرانسپورٹ کمپنی

۲۱۔ زکریا اسٹریٹ کلکتہ ۱

اتر پردیش، مدھیہ پردیش، دہلی، بمبئی